جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان
ماہنامہ
محدثِ عصر
بانی
فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ
مدیر
سید احمد خضر شاہ مسعودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بیادگار: محدثِ عصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ

جامعہ امام محمد انور شاہ دیوبند کا علمی، دینی، ادبی ترجمان

ماہنامہ

محدثِ عصر

جنوری رفروری ۲۰۱۹ء جلد نمبر ۲۰، شمارہ نمبر ۲، ۱ سلسلہ ۱۸۸

بانی: فخر المحدثین حضرت مولانا سید انظر شاہ مسعودی کشمیری رحمہ اللہ

مدیر: سید احمد خضر شاہ مسعودی

نائب مدیر

مولانا فضیل احمد ناصری
08881347125

نگراں ترسیل

مولانا ابوطلحہ اعظمی
09997504588

شائع کردہ

جامعۃ الامام محمد انور شاہ دیوبند

عقب عیدگاہ، دیوبند 247554 (یوپی)

فون آفس: 01336-220471 فون وفیکس (مدیر) 01336-222471-223371

موبائل (مدیر): 08006075484

ای۔میل: ahmadanzarshah@gmail.com

اشتراک وتعاون

اندرونِ ملک:

فی شمارہ -/15 سالانہ -/150

خصوصی -/1000

تاحیات -/10000

بیرونِ ملک:

سالانہ: 20 امریکی ڈالر

خصوصی: 100 امریکی ڈالر

تاحیات: 500 امریکی ڈالر

Composed by: Umar Ilahi, Deoband # 9358013409

ورق در ورق

❀......✦......❀

صریر خامہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عصریات

❖سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری

رام مندر کا مسئلہ ہمیشہ کی طرح پھر سرخیوں میں ہے، تیز و تند بیانات، رنگ بہ رنگ اعلانات اور نفرت انگیز ہفوات آئے دن کی کہانیاں ہیں۔ ایک لیڈر زہر اگلتا ہے اور دوسرا اس سے بھی کڑوا، جب کہ تیسرا اس سے بھی زیادہ مسموم۔ گویا مقابلہ آرائی ہے، ہر شخص اسی فکر میں ہے کہ اس کا بیان زیادہ زہریلا ثابت ہو۔ یوپی کے وزیراعلیٰ مسٹر یوگی نے راجستھان میں منعقدہ ۳ر نومبر ۲۰۱۸ء کی ریلی میں بڑا دعویٰ کر دیا کہ دیوالی کے بعد رام مندر کی تعمیر جلد شروع ہو جائے گی، وہ اشتعال انگیزی کرتے ہوئے یہ کہنا بھی نہیں بھولے کہ ''رام کے نام پر آپ کی خواہش میرے علم میں ہے'' لگے ہاتھوں وہ یہ بھی فرما گئے کہ ۶ر نومبر ۲۰۱۸ء کو ہر ہندوستانی کے گھر میں رام نام کا ایک دیا ضرور روشن ہونا چاہئے۔ یوپی کے نائب وزیراعلیٰ کیشو پرساد موریہ بھی نفرت انگیزی کا اظہار بایں الفاظ کرتے ہیں: ''اجودھیا میں رام مندر کی تعمیر ہو کر رہے گی۔'' مزید فرماتے ہیں: ''کچھ بھی ہو جائے، بابر کے نام کی ایک بھی اینٹ یہاں رکھنے نہیں دیں گے''

اوائل نومبر ۲۰۱۸ء ''دھرما دیش'' کے عنوان سے دہلی کے تال کٹورا اسٹیڈیم میں ملک گیر سطح کی ایک تقریب منعقد ہوئی، جس میں تین ہزار سادھوؤں نے شرکت کی۔ اس تقریب کا موضوع بھی رام مندر رہا۔ ملک بھر کے سادھو سنتوں نے اس تقریب میں مرکزی حکومت کے خلاف اپنی بھڑاس نکالی اور سخت ترین بددعائیں دیں۔ رام بھدر آچاریہ نے کہا: ''رام مندر یا تو آرڈی نینس کے ذریعے بن سکتا ہے یا پھر خوش گوار ماحول سے۔ اب حالات قابو سے باہر ہو رہے ہیں، ہمارا صبر ٹوٹ رہا ہے، ہم ایودھیا میں رام مندر چاہتے ہیں، جب سپریم کورٹ ایک دہشت گرد کے لئے آدھی رات میں کھولا جا سکتا ہے تو پھر مذہبی عقیدے کا معاملہ کیوں ٹالا جا رہا ہے؟ اگر موجودہ حکومت ۲۰۱۹ء سے قبل رام مندر کی تعمیر میں ناکام رہتی ہے تو بھگوان اسے سزا دے گا۔''

سادھوسنتوں کی بددعاؤں اور کوششوں کے قصے کے بعد اب آر ایس ایس کی سنئے۔ یہ بھگوا تنظیم رام مندر کے مسئلے کو لے کر یوں بھی کچھ زیادہ ہی اتاؤلی رہی ہے۔ نومبر ۲۰۱۸ء میں جہاں دیگر سیاست دانوں نے اس موضوع کو شدت سے اٹھایا وہیں اس بہتی گنگا میں آر ایس ایس نے بھی ہاتھ دھوئے، اس نے حکومت کو سخت ترین انتباہ دیتے ہوئے کہا کہ اگر ضرورت پڑی تو ۱۹۹۲ء جیسے مظاہرے سے بھی دریغ نہیں کیا جائے گا۔

بابری مسجد اور رام مندر کا قضیہ بھی عجیب ہے، تصفیئے کا نام ہی نہیں لیتا، دو دہائیوں سے زیادہ عرصے سے عدالت میں زیر سماعت ہے، مگر ہنوز روز اول۔ اس دوران کتنی ہی حکومتیں آئیں اور گئیں، کتنے ہی انقلابات آئے اور گئے، کتنے ہی طوفاں آئے اور بھولی بسری داستان بن گئے۔ ایک تاریخ طے ہوتی ہے اور سماعت کے لئے پھر اگلی تاریخ، بات یہاں بھی نہیں بنتی اور اگلی سماعت کے لئے پھر نئی تاریخ۔ ڈھائی دہائیوں سے یہی چل رہا ہے اور اللہ ہی جانتا ہے کہ یہ سلسلہ کب تک چلے گا۔ رواں سال کی ۴رجنوری امید تھی کہ مسئلہ کی طرف کوئی پیش رفت ہوگی مگر سماعت پھر ۱۰رجنوری تک ٹل گئی۔ ۱۰رجنوری کو توقع تھی کہ کچھ نہ کچھ کارروائی تو ہو ہی جائے گی لیکن وائے ناکامی! سپریم کورٹ کی پانچ رکنی بینچ سے جسٹس للت علیحدہ کیا ہوئے، تاریخ پھر ٹل گئی اور ۲۹رجنوری کی نئی تاریخ مقرر ہوئی۔ باشندگانِ وطن کو اس بار قوی امید تھی کہ ۲۹رجنوری کو سماعت ضرور ہوگی لیکن ان کے اس ارمان پر ایک بار پھر پانی پھر گیا۔ عدالتِ عظمیٰ نے ۲۷رجنوری کو ایک نوٹس جاری کرتے ہوئے کہا کہ ''جسٹس اے بوبڑے کی عدم موجودگی کی وجہ سے آئینی بنچ اس معاملے کی سماعت ۲۹رجنوری کو نہیں کر سکے گی۔''

تاخیر در تاخیر، پھر تاخیر در تاخیر سے انتہا پسند ہندو تنظیمیں بوکھلائی ہوئی ہیں اور اناپ شناپ بول رہی ہیں۔ انہیں یقین تھا کہ مودی حکومت یہ قضیہ آخر کار چکا کر رہے گی، خواہ اس کے لئے آرڈیننس ہی کیوں نہ لانا پڑے۔ ادھر طرفہ معاملہ یہ ہوا کہ وزیر اعظم مسٹر مودی نے رام مندر پر آرڈیننس نہ لانے کا اعلان کر دیا، اس سے رام بھگت اور سیخ پا ہیں۔ دوسرے تو کیا، خود آر ایس ایس نے تنقید در تنقید کے دہانے کھول دیئے، پہلے بھیا جی جوشی نے ناگواری ظاہر کی، ان کے بعد آر ایس ایس سربراہ مسٹر بھاگوت نے۔ بھاگوت کہتے ہیں: ''آر ایس ایس کے جنرل سکریٹری بھیا جی جوشی کے بیان کی میں حمایت کرتا ہوں، وزیر اعظم چاہے جو بھی کہیں، اس معاملے میں ہمارا نظریہ بالکل واضح ہے۔ بھگوان رام میں ہماری آستھا ہے اور ایودھیا میں رام مندر کی تعمیر ہونی چاہئے۔''

اسی پر بس نہیں، ۳۰ر جنوری کو الہ آباد میں سادھوسنتوں کا ''دھرم سنسد'' انعقاد پذیر ہوا، اس تقریب میں دھرم سنسد نے اعلان کیا کہ رام مندر کے خواہش مندوں کا ایک بڑا قافلہ ۲۱ر فروری کو الہ آباد سے ایودھیا تک کوچ کرے گا اور تعمیر مندر کے لئے سعیِ بلیغ کرے گا۔ یہ سادھو سپریم کورٹ سے بھی سخت ناراض ہیں اور آئے دن اس پر جارحانہ تبصرے کر رہے ہیں۔ دھرم سنسد کی طرف سے جاری بیان میں ہے کہ:

''افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ کتے تک کو انصاف مل رہا ہے، لیکن رام جنم بھومی کے معاملے میں انصاف نہیں ہو رہا ہے۔'' تقریب میں شریک ایک نمایاں سادھو سروپانند سرسوتی نے کہا کہ ''ہم ۲۱ر فروری کو رام مندر کی تعمیر کی بنیاد رکھیں گے۔'' وہ یہ دھمکی بھی دے ڈالتے ہیں ''اگر سادھوسنتوں کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کی گئیں تو ہم پورے ہندو سماج کو ''دھرم آدیش'' (مذہبی پیغام) جاری کریں گے کہ جب تک مندر تعمیر نہیں ہو جاتا تب تک ہر ہندو کا فرض ہے کہ وہ گرفتاری دینے کے لئے تیار رہے اور یہ مظاہرہ تب تک جاری رہے گا جب تک رام جنم بھومی ہندوؤں کو نہ سونپ دی جائے اور جب تک ہم رام مندر نہیں بنا لیتے۔''

وشو ہندو پریشد کے زیر اہتمام یہ دھرم سنسد کمبھ میں کئی دن جاری رہا، اس کے سربراہوں کے بقول:

''دھرم سنسد کی اتھل پتھل کے دوران کچھ ہوا تو ٹھیک، ورنہ اس کے بعد کچھ ضرور ہوگا۔ اگر ضرورت پڑی تو ہمیں کہنا پڑے گا اب صبر سے کام نہیں لیا جائے گا۔ ٦ر اپریل کو ایک کروڑ لوگ وجے منتر کا جاپ کریں گے۔''

رام مندر کے حامیوں کے ان جیسے نہ جانے کتنے بیانات آچکے ہیں، ہر بیان سمِ قاتل، ہر اعلامیہ ملکی سلامتی کے لئے بے حد خطرناک، مگر حیرت ہے کہ حکومت خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ رام مندر کے حامیوں نے صرف عوام کو ہی دہشت زدہ نہیں کیا بلکہ مرکزی حکومت کو بھی للکارا، اسے چیلنج بھی کیا، اس سے بھی آگے بڑھ کر عدالت، وہ بھی عدالت عظمیٰ کو آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ سب ہوتا رہا اور پاسبانِ وطن کچھ نہ کر سکے۔ کیا ملک ایسی ہی غنڈہ گردی سے آگے بڑھے گا؟ کیا ہندوستان کا آئین اب کسی مصرف کا نہیں رہا؟

❁ .... ❁ .... ❁

اگلے ماہ (مارچ) میں ۲۰۱۹ء کے عام انتخابات کی تاریخوں کا اعلان ہو جائے گا۔ تمام سیاسی پارٹیاں کمر بستہ ہو چکیں، جگہ جگہ ریلیاں چل رہی ہیں، جلسے ہو رہے ہیں، تیز طرار تقریریں ہو رہی ہیں، الزام، جوابی الزام کا روایتی دور دورہ ہے۔ بھاجپا اپنا اقتدار بچانے کی تدبیریں کر رہی ہے۔ حزب اختلاف زعفرانی پارٹیوں کا راستہ روکنے میں مصروف ہے۔ سب ایک دوسرے کی خامیاں گنوانے میں لگی ہوئی

ہیں۔ بھاجپا پُر امید ہے کہ اس کا تختِ شاہی کہیں نہیں جائے گا۔ پانچ سالہ نفرت انگیز سیاست سے اس کو بڑی توقعات وابستہ ہیں، تین طلاق کے خلاف اس کی تحریک، مسلم ناموں والے علاقوں کے نام کی تبدیلی، گائے کا تحفظ اور ان گنت نفرت انگیز موضوعات کے سہارے وہ میدان مارنا چاہ رہی ہے، حالاں کہ ان برسوں میں اس کے پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا۔ اس کی بہت سی حلیف پارٹیاں اس سے دامن جھٹک چکی ہیں۔ شیوسینا اور اکالی دل اس کے خلاف سرگرم ہیں۔ آسام سنگرام پریشد بھی علیحدہ ہو چکی، اس کے علاوہ بھاجپا باہمی اتحاد سے بھی محروم ہے، رافیل اور رام مندر کے مسئلے نے حکمراں محاذ کو دن میں تارے دکھائے ہیں، بڑے بڑے گھوٹالے، بڑی بڑی بدعنوانیاں، بے لگام مہنگائی، بڑھتی بے روزگاری اس کی نیند اڑا چکی ہے، تاہم اسے یقین ہے کہ اس کا جادو پھر بولے گا اور سر چڑھ کر بولے گا۔

ادھر حزب اختلاف بھی ادھیڑ بن میں مبتلا ہے، یوپی میں ایس پی اور بی ایس پی کے درمیان عظیم اتحاد قائم ہو چکا۔ بہار کا عظیم اتحاد یوپی سے زیادہ توانا اور کثیر الجماعت ہے۔ تاہم تشویشناک امر یہ ہے کہ کانگریس یوپی میں اکیلے ہی انتخابات لڑنے کا اعلان کر چکی۔ اسے ایس پی اور بی ایس پی کے ساتھ جڑنا چاہئے تھا، عام آدمی پارٹی بھی تنہا میدان میں اتر رہی ہے۔ عظیم اتحاد طاقت ور تو ہے مگر اتنا بھی نہیں کہ اس کی فتح کو یقینی سمجھا جا سکے۔

یہ ضرور ہے کہ کانگریس نے راہل کی قیادت میں کچھ استحکام حاصل کر لیا ہے۔ راہل گاندھی بھی ایک مشاق سیاست داں کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ ادھر ان کی بہن پرینکا گاندھی بھی سرگرم سیاست میں قدم رکھ چکیں، اگر چہ ان کا فیصلہ ہے کہ وہ الیکشن نہیں لڑیں گی، تاہم ماحول سازی میں مصروفِ عمل ہیں۔ ان دونوں بھائی بہن کے بیانات، ان کی سیاسی سرگرمیاں، ان کے عوامی رابطے نسبتاً بہتر ہوئے ہیں مگر یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہئے کہ سیاسی بساط پر کامیابی کے لئے جوش کے ساتھ ہوش اور طاقت کے ساتھ حکمت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اب بھی وقت ہے کہ کانگریس یوپی کے عظیم اتحاد کا حصہ بنے۔ اس کے پاس موجودہ حکومت کی ناکامیوں کی بھی ایک طویل فہرست ہے۔ پلوامہ (کشمیر) میں لگ بھگ ۵۰ رفوجیوں کی موت کا تازہ ترین سانحہ بھی۔ اگر کانگریس ہوشیاری اور تیاری کے ساتھ میدان میں اترتی ہے تو اس کی فتح کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

❀ .... ❀ .... ❀

گذشتہ دنوں ای وی ایم کا مسئلہ بھی گرمانا رہا، سماجوادی پارٹی اور بہوجن سماج پارٹی نے اس پر حکومت کو خوب گھیرا اور طنز وتنقید کے تیر برسائے، ان کا کہنا تھا کہ ترقی یافتہ مما لک میں انتخابات بیلٹ پیپر سے ہوتے ہیں، پھر ہندوستان میں کیوں نہیں؟ چند ماہ قبل عام آدمی پارٹی نے بھی اس مسئلہ کو بڑی شدومد کے ساتھ اٹھایا تھا اور ایوان میں دعویٰ کیا تھا کہ ای وی ایم میں چھیڑ چھاڑ ممکن ہے اور اس کا نمونہ بھی پیش کیا تھا، حال ہی میں ایک امریکی سید شجاع نے انکشاف کیا تھا کہ ۲۰۱۴ء میں ای وی ایم کے ساتھ چھیڑ چھاڑ ہوئی تھی، اس دعوے کے سامنے آتے ہی ملک بھر میں سیاسی پارہ تیز ہو گیا تھا اور مرکزی حکومت کے لئے جواب مشکل ہو گیا تھا۔

یہ درست ہے کہ انتخابات درست اور شکوک وشبہات سے پاک ہونے چاہئیں۔ اگر بعض پارٹیاں بیلٹ پیپر سے ووٹنگ کا مطالبہ کر رہی ہیں تو ان کا مطالبہ حق بجانب ہے۔ ہر شہری کی خواہش ہے کہ حق رائے دہی کا استعمال صاف شفاف طریقے سے ہو اور منتخب حکومت داغ دھبے سے محفوظ رہے۔

تین طلاق کا مسئلہ پچھلے سال ۲۰۱۷ء بھی زور وشور سے اٹھا تھا، حکومت نے لوک سبھا میں تین طلاقوں کے خلاف بل پاس بھی کر لیا تھا، لیکن راجیہ سبھا میں اپوزیشن نے اسے چلنے نہیں دیا۔ حکومت آرڈی نینس لائی اور تین طلاق دینے والوں کے خلاف سخت ترین سزاؤں کا اعلان کیا۔ بل کی خاص بات یہ تھی کہ تین طلاقیں دے دینے سے کوئی طلاق نہیں پڑے گی اور شوہر کو تین سال کے لئے جیل بھی جانا پڑے گا۔ تین برسوں کا نان نفقہ بھی اسی کے ذمے ہوگا۔ اس بل کے خلاف مسلمانوں نے زور آزمائی تو کی ہی، سیکولر طبقے نے بھی اس کے خلاف زوردار آواز بلند کی۔ پچھلے دسمبر میں ایک بار پھر یہ بل لوک سبھا میں پیش ہوا اور پاس ہو گیا مگر راجیہ سبھا میں ایک بار پھر منہ کے بل گر گیا۔ اپوزیشن جماعتیں اس بل کے سخت خلاف ہیں اور اسے خواتین پر ظلم تصور کرتی ہیں۔ کانگریس کا اعلان ہے کہ حکومت بننے پر یہ بل ختم کر دیا جائے گا۔

موجودہ حکومت میں جس کمی کا شدت سے احساس ہوا، وہ قانون کی بالادستی کے فقدان کا ہے۔ گئو رکشکوں اور ہجومی تشدد کے علم برداروں نے ملکی آئین کے ساتھ جس طرح کھلواڑ کیا، اس نے ہندوستان کی جمہوری اقدار کو تڑپا کر رکھ دیا ہے۔ اب سے پہلے ملک ان حالات سے کبھی نہیں گزرا تھا۔ آئین کی روح کو جس طرح مجروح کیا گیا، اس سے ساکنانِ وطن کی تشویش درست ہے۔ آئین کے ساتھ شر پسندوں کا یہی رویہ رہا تو بھاجپا کے لئے اقتدار کا خواب خواب ہی رہ جائے گا۔ اس کے آثار اب نظر بھی آنے لگے ہیں۔

❀ .... ❀ .... ❀

ذٰلِكَ الْكِتاب

فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ صاحب کشمیری نور اللہ مرقدہ

الرحمن الرحيم اسمان بنيا للمبالغة من رحمن كالغضبان من غضب والعليم من علم والرحمة فى اللغة رقة القلب وانعطاف يقتضى التفضل والاحسان. ومنه الرحم لانعطافها على ما فيها و اسماء اللّٰه تعالٰى انما توخذ باعتبار الغايات التى هى افعال دون المبادى التى تكون انفعالات.

ترجمہ: رحمان اور رحیم رَحِمَ سے ماخوذ ہیں، جیسا کہ غضبان غَضِبَ اور علیم عَلِمَ سے، ان دونوں اسم سے رحمت کو مبالغۃً ظاہر کرنا ہے۔ قلب کی نرمی اور نفس انسانی کا کسی جانب اس طرح میلان جو دوسرے کے ساتھ حسنِ سلوک کا تقاضا کرتا ہو، اور رحم (بچہ دانی، عورت کا اندرونی عضو جس میں نطفہ استقرار پاتا ہے) رَحِمَ سے ہی ماخوذ ہے چوں۔ یہ عضو بھی اس چیز پر نرم ہوتا ہے جو اس میں موجود ہو، نیز یہ بھی ملحوظ رہے کہ خدا تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں آثار ملحوظ ہوتے ہیں اور ان میں خود تاثیر کی شان ہوتی ہے، ان میں اسماء کے مبادی معتبر نہیں جس میں مؤثر ہونے کے بجائے متاثر ہونے کی شان ہے۔

تشریح: رَحمان رَحِیْم کے سلسلہ میں چند ابتدائی گذارشات قابل توجہ ہیں، اس میں جمہور نحاۃ اور امام النحو سیبویہ کا اختلاف ہے۔ جمہور کا خیال ہے کہ یہ دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں، لیکن ان سے مضمون مبالغہ بھی نمایاں ہوتا ہے؛ اگر چہ رحمان فعلان کے وزن پر ہے اور رحیم فعیل کے وزن پر، لیکن فعلان و فعیل دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں۔ صفت مشبہ دوام شے وثبوت شے پر دلالت کرتی ہے اور مداومت وثبوت میں معنی کی زیادتی ہوتی ہے تو وہ طبعاً مبالغہ کا کام دیں گے، نیز مشہور ادیب ونحوی، مفسر قرآن زمخشری جو عقیدۃً معتزلی ہے، کی رائے ہے کہ جب کوئی صیغہ اپنی اصل کو چھوڑ دے اور دوسری صورت اختیار کرے تو اس دوسری صورت میں مبالغہ زیادہ ہوگا۔ اس تحقیق کے بعد یہ بات بہ آسانی کہی جاسکتی ہے کہ

رحمان و رحیم راحم سے معدول ہیں تو راحم میں مبالغہ خود تھا۔اس شکل کو چھوڑنے کے بعد رحمان ورحیم میں بیش از بیش مبالغہ پایا جائے گا،اس لئے جمہور ہر دو صیغوں یعنی رحمان ورحیم کو مبالغہ کے لئے کارآمد بتاتے ہیں۔سیبویہ کی تحقیق کے مطابق رحمان صفت مشبہ ہے لیکن رحیم کو وہ صفت مشبہ نہیں مانتے، بلکہ ان کے خیال میں یہ اسم فاعل ہے،جس کی وضع اظہار مبالغہ کے لئے ہے، ہر دو آراء آپ کے سامنے آ چکیں جن سے آپ کو معلوم ہوگا کہ رحمان ورحیم صفت کے صیغے ہیں لیکن قاضی بیضاوی نے ان کو اسمان کہا درانحالیکہ اسم صفت سے علیحدہ چیز ہے۔

اس اشکال کو اس طرح حل کیا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب نے جو **اسم** کا لفظ استعمال کیا وہ کلمہ کی قسم اور حرف وفعل کا قسیم نہیں،اس توضیح کے بعد اسم صفت کو بھی شامل ہوگا۔

ایک دوسری الجھن یہ ہے کہ مصنفؒ کو **اسمان وضعا للمبالغة** کہنا چاہئے تھا لیکن انہوں نے بُنِیا تثنیہ کا صیغہ استعمال کیا۔مصنفؒ کو اس تغیر کی اس وجہ سے ضرورت پیش آئی کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں،ایسا نہیں، یہ مبالغہ کا کام دیتے ہیں مگر مبالغہ کے صیغے نہیں ہیں۔

جمہور نحاۃ کی تحقیق کے مطابق واضح ہے کہ یہ صیغے مبالغے کے نہیں،اور سیبویہ کے خیال میں رحمان تو زیر بحث نہیں آئے گا کیوں کہ وہ بھی اسے مبالغے کا صیغہ نہیں مانتے۔البتہ وہ رحیم کو صیغۂ مبالغہ مانتے ہیں اور چوں کہ مفسر کی رائے میں جمہور کی تحقیق قرین صواب ہے،اس لئے انہوں نے عبارت میں ان ہی کی تحقیق کی تائید کے لئے سوچ سمجھ کر الفاظ استعمال کئے اور سیبویہ کا خیال ان کے خیال میں وقیع نہیں تو عبارت میں اس کی رعایت بھی ضروری نہیں تھی۔

قاضی صاحبؒ نے رحمان و رحیم کے کچھ نظائر بھی بیان کر دیئے ،نظائر جو پیش کئے گئے ہیں ان سے ایک اشکال ہو گیا: وہ یہ کہ جب بقول جمہور یہ دونوں صفت مشبہ کے صیغے ہیں اور صفت مشبہ لازم سے تیار ہوتی ہے نہ کہ متعدی سے تو رَحِمَ جو کہ متعدی ہے اس سے رحمان ورحیم کو مشتق ماننا اور پھر صفت مشبہ کے صیغے قرار دینا عجیب سی بات ہوگی۔اس کا حل یہ ہے کہ بعض متعدی کو لازم کی طرف منتقل کر دیتے ہیں، یہاں ایسا ہی کیا گیا کہ رَحِمَ متعدی کو لازم سمجھ لیا گیا۔مزید وضاحت اس نکتہ کی یہ ہے کہ کچھ افعال انسان کے خلقی ہوتے ہیں اور یہ افعالِ خلقیہ انسان کو لازم رہتے ہیں،مثلاً کھانا پینا وغیرہ۔اور افعالِ خلقیہ کے اظہار کے لئے عربی میں کَرمَ کارآمد ہے،رَحِمَ اگر چہ باب سمع سے مستعمل ہے،مگر ایک خلقی فعل کی نمود ونمائش کے لئے

جب کام دیتا ہے تو گویا لازم ہو گیا۔ زمخشری نے بھی رفیع الدرجات میں یہی تقریر کی ہے، اسی تقریر پر رحمان و رحیم کو قیاس کیا گیا۔

ان نحوی مباحث سے فراغت پر لفظ رحمت کی لغوی تحقیق پیش نظر ہے۔ تو واضح رہے کہ رحمت میں لطافت قلب کا مفہوم ہے، بلکہ اس میں عنایات بے کراں کا اظہار بھی ہوتا ہے، رحمِ مادر بھی اس وجہ سے رحم کہلایا کہ خود رحمت (بچہ دانی) بچہ پر التفات تمام رکھتا ہے۔ نیز یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ توجہ کبھی روحانی ہوتی ہے اور کبھی جسمانی۔ اور یہاں ہر دو توجہات مراد ہیں۔

و اسماء اللہ سے ایک اشکال اور اس کا جواب دیا جا رہا ہے جس کی تمہید یہ ہے کہ عام خلائق میں تو فاعل بھی ہوتے ہیں اور مفعول بھی، موثر بھی اور اثر قبول کرنے والے بھی، لیکن خدا تعالیٰ کی شان اعلیٰ وارفع چاہتی ہے کہ انہیں ہمیشہ اثر آفریں مانا جائے۔ قبولِ اثر ان کے لئے زیبا نہیں ہے۔ بعبارۃ اخری یلیق لہٗ ان یکون فاعلا ولا ینبغی ان یکون منفعلا۔ اب رحمت کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ کسی حالتِ زار پر پہلے متاثر ہوئے، پھر رحم فرمایا۔ دیکھئے یہاں ابتداءً تاثر پایا گیا جو شایانِ شان خدا نہیں، اس لئے کہنا پڑے گا کہ خدا تعالیٰ کے لئے جب اس طرح کی چیزیں استعمال ہوں تو آغازِ کار ان میں معتبر نہیں ہوگا جن میں انفعال و تاثر کی بو ہوتی ہے، بلکہ نتائج و ثمرات پیش نظر ہوں گے جہاں فاعلیت نمایاں ہوتی ہے، اسی کو اصطلاحی الفاظ میں مجاز مرسل یا استعارہ تمثیلیہ کہا جا سکتا ہے۔ مجاز مرسل میں سبب بول کر مسبب مراد لیا جاتا ہے تو رحمان میں بھی سبب کا اطلاق ہے لیکن مراد مسبب ہے، اور مسبب انعام و احسانات ہیں، استعارہ تمثیلیہ کا مطلب یہ ہے کہ کچھ اشیاء کے اجتماع سے ایک خاص ہیئت تیار ہوئی، اس ہیئت منتزعہ کو کسی دوسری ہیئتِ منتزعہ سے تشبیہ دینا، مثلاً: چند بجلی کے قمقمے روشن ہیں، ان کی اجتماعی روشنی سے جو ہیئت تیار ہوئی اسے ہم کسی دوسری ہیئت سے تشبیہ دیں۔

جب استعارہ تمثیلیہ سمجھ میں آ گیا تو اللہ تعالیٰ مخلوق پر انعام و احسان کرتے ہیں اور ان سے مصائب کو دور فرماتے ہیں، دنیاوی بادشاہ بھی اپنے رعایا کے حالِ زار پر دل سوزی اور کرم و عنایت کا معاملہ کرتے ہیں تو معاملاتِ ملوکِ دنیا مشبہ بہ ہے اور حضرت حق جل مجدہٗ کا معاملہ مشبہ، مشبہ بہ (یعنی حسن سلوک بادشاہانِ دنیا) کے لئے جو الفاظ عموماً استعمال ہوتے رہتے ہیں۔ حضرت حق عمل کے لئے وہ الفاظ استعمال کر لئے گئے اور یہی استعارۂ تمثیلیہ ہے۔

قاضی صاحبؒ کی ان تشریحات سے ہٹ کر یہ بھی یاد رکھئے کہ صیغۂ رحمان ایک ایسی زیادتی کا اظہار کرتا

ہے جس کے بعد کوئی اور درجہ زیادتی کا نہ ہو۔ چنانچہ تاج العروس میں ہے کہ **معناہ عندہ اهل اللغة ذو الرحمة اللتی لا غایة بعدها فی الرحمة**. یہ بھی عجیب لطیفہ ہے کہ تسمیہ میں لفظ اللہ پہلے استعمال ہوا، جو صرف ذاتِ خدا کے لئے استعمال ہوسکتا ہے، اس موصوف کے بعد صفات کی تفصیل چلی تو پہلے وہ صیغہ استعمال کیا یعنی رحمان، جس کا اطلاق صفات میں بھی ذاتِ خدا کے علاوہ کسی اور پر نہیں۔ چنانچہ مفردات میں امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے: **لا یطلق الرحمن الا علیٰ للّٰه تعالیٰ**. کلام میں یہ رعایتیں بجز خدا تعالیٰ کے اور کون رکھ سکتا ہے۔

اس نکتہ کو بھی نظر انداز کیجئے اسم ذاتی یعنی اللہ کو استعمال کرنے کے بعد متصلاً خدا تعالیٰ نے جو اسم صفاتی اختیار کیا ہے وہ رحمتوں کا مظہر اتم ہے جس سے سابقہ آسمانی کتابیں خالی ہیں اور غالباً اس طرف اشارہ مقصود ہے کہ بعثتِ نبوی بھی ہماری رحمت تھی، پھر اس نبی آخر الزماں کا تم قریشیوں میں ہونا بھی ہماری رحمت اور اس جلیل نبیؐ پر نزولِ قرآن بھی رحمت کا مظہر ہے۔ قاضی صاحب عنقریب **رحیم و رحمان** میں فرق کریں گے، لیکن ہم سے یہ فرق سن لیجئے کہ **رحیم** کے مفہوم میں تکرار پیش نظر ہے۔ بحر المحیط میں اندلسی نے لکھا ہے کہ رحیم **مبالغة الفعیل من حیث التکرار**، گویا کہ **رحمان** رحمت میں آخری بلکہ وراء الوریٰ درجہ کا اظہار کرتا ہے اور **رحیم** رحمت کی آخری کثرت کو نمایاں کرتا ہے۔ **رحمان** میں رحمتیں سب پر حاوی ہیں، مومن ہو یا کافر، چنانچہ اس کا ظہور دنیا میں ہے، اور رحیم میں خدا تعالیٰ کی شانِ مغفرت کا اظہار ہے اور ان کی اخروی رحمت بشکل مغفرت مومن کے ساتھ ہوگی، اس لئے اس کا ظہور آخرت میں ہوگا۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے کہ **الرحمان، رحمان الدنیا والرحیم، رحیم الآخرة**. مصنف روح المعانی اپنی تفسیر میں محققین کی آرا وافکار کے ساتھ صوفیانہ تشریحات کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ حضرات صوفیاء کے خیال میں رحمانیہ وہ تربیت ہے جس میں کوئی واسطہ مربی اور تربیت یاب کے درمیان ہو، اور رحمت میں کوئی واسطہ درمیان میں نہیں ہوتا۔

راقم الحروف کا خیال ہے کہ صوفیاء کی یہ تشریح اس حدیث پر مبنی ہے کہ مغفرت عمل سے نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمت سے ہوتی ہے، اور مغفرت کا تعلق آخرت سے ہے تو اخروی زندگی میں رحمت کسی بھی واسطے کے بغیر تا آنکہ عمل کے بغیر اپنا کام کرے گی اگر چہ قاضی صاحب بھی ان دونوں کے فرق پر گفتگو کریں گے، اس گفتگو کو قبول کرنے کے لئے آپ کے ذہن کی ہمواری یہیں سے احقر نے کر دی ہے۔ (جاری)

❀ .... ❀ .... ❀

ہندوستان میں
اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی

علامہ سید سلیمان ندویؒ

بایں ہمہ محمد نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا کہ وہ فاتح سے زیادہ ایک مبلغ ہے، چنانچہ اس نے برہمنوں میں بھی عام اعلان کرادیا کہ جو چاہے اسلام اختیار کرے، اس سے جزیہ معاف ہوگا، مگر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کی طرح اس پر زکوٰۃ فرض ہے اور جو اپنے آبائی مذہب پر قائم رہنا چاہے وہ بخوشی رہ سکتا ہے۔

''بعضے از ایشاں بر اقامت معاودت نمودند وبعضے دل برگزیدہ نہادند وبرکیش اسلاف می رفتند''

چچ نامہ کا یہ فقرہ ہے، اس کے ساتھ یہ ہے:

''ان میں جو مسلمان ہوگئے تھے وہ غلامی اور جزیہ وغیرہ سے آزاد رہے اور جو اپنے مذہب پر قائم رہے ان کے تین درجے قائم کئے گئے، اعلیٰ طبقہ یعنی امراء کے لئے ۴۸ درم، متوسط کے لئے ۲۴ درم اور اونچے طبقہ کے لئے ۱۲ درم، ٹیکس مقرر ہوا اور یہ حکم دیا گیا کہ جو لوگ مسلمان ہوجائیں وہ اس سے معاف کئے جائیں (لیکن ان پر مسلمانوں کی طرح جزیہ کے بجائے ڈھائی فی صد زکوٰۃ ضرور ہی واجب ہوگی، جس کی مقدار جزیہ سے زیادہ ہی رہی) چنانچہ جن لوگوں نے اسلام قبول کرلیا تھا وہ جزیہ سے معاف ہوئے اور جو لوگ اپنے آبائی مذہب پر رہے انہوں نے جزیہ دیا لیکن ان کی زمینیں اور جائیدادیں ان سے نہیں لی گئیں بلکہ علی حالہا ان کے ہی قبضہ میں رہنے دی گئیں۔'' (چچ نامہ، ص:۱۸۲، الیٹ ج۱)

کیا اس اقتباس سے یہ پوری طرح واضح نہیں ہوتا کہ فاتح سندھ نے اپنے مذہب کی اشاعت میں کبھی بھی تشدد اور سختی کا استعمال نہیں کیا بلکہ اس نے ہر مذہب کو جائز آزادی عنایت کی، جزیہ کی رقم جو وصول کی گئی وہ حد درجہ معمولی ہے، یعنی زیادہ سے زیادہ ۴۸ درم، اور کم سے کم ۱۲ درم، موجودہ انگریزی اسکول کے

مطابق گویا اس نے امراء سے سالانہ دس روپئے، متوسط طبقہ سے سالانہ پانچ روپئے اور غرباء سے سالانہ ڈھائی روپئے لئے اور اس سے زیادہ بڑھ نہیں سکتا تھا، اس کے مقابلہ میں دیکھو کہ مسلمانوں سے جو رقم وصول کی جاتی تھی وہ فی شخص مقرر نہ تھی بلکہ اس کی آمدنی کے اعتبار سے ڈھائی فی صدی لی جاتی تھی، جو دس روپیہ سالانہ سے بہت زیادہ ہو جاتی تھی، اس پر بھی اگر ہمارے آریہ دوست یہ کہیں کہ اس جزیہ کے سبب سے ہندوؤں نے اسلام قبول کر لیا تھا تو اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہندوؤں کی نگاہوں میں ان کا مذہب خود اس قدر کم رتبہ تھا کہ ان کے امراء کے نزدیک دس روپئے سالانہ، متوسطین کے نزدیک پانچ روپئے سالانہ اور غرباء کے نزدیک دو روپئے آٹھ آنہ سالانہ بھی ان کے دھرم کی قیمت سے زیادہ گراں تھا، تو یہ مسلمانوں کا قصور نہیں۔

محمد بن قاسم نے سندھ سے فراغت کر کے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی ہندوؤں کے سامنے اپنے مذہب کی تبلیغ کی، چنانچہ یہی ملتان میں اس نے کیا، مگر کسی ایک کو بھی اس نے اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا۔ سندھ کے محدود رقبہ کے باہر سندھ سے متصل جو ایک حقیقی ہندوستان یعنی قنوج کی سلطنت تھی، محمد نے اپنے داعی وہاں راجہ کے دربار میں بھی بھیجے، چنانچہ ایک ہزار دستہ کی حفاظت میں اس نے راجہ قنوج کے پاس اپنے مبلغ بھیجے کہ اسلام کا ہدیہ قبول کرو، مگر اس نے بدقسمتی سے انکار کیا۔ (چچ نامہ، ص: ۲۰۷)

محمد کچھ اور آگے کارروائی کرنا چاہتا تھا مگر اس کو موقع نہ ملا اور دربارِ خلافت کی طلب پر وہ واپس گیا، جب وہ یہاں سے جانے لگا تو اہل سندھ نے اس کا بڑا ماتم کیا اور اس کے مجسمے بنا بنا کر یادگار قائم کی۔ (فتوح البلدان، بلاذری، ص: ۲۴۰)

ہم صفحات بالا میں اپنے ناظرین کو سندھ کے علاقہ کی سیر کرا رہے تھے، اب بھی ہم وہیں ہیں، محمد بن قاسم کی فتوحات **۹۳ھ** میں اور اس کے بعد ہوئی تھیں، یہ خلیفہ عبدالملک کا زمانہ تھا، اس کے بعد **۹۶ھ** میں سلیمان عبدالملک خلیفہ ہوا اور **۹۹ھ** میں اس نے وفات پائی، اس کے انتقال کے بعد حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے، جنہوں نے ۱۰۱ھ میں اس عالم کو الوداع کہا، اسی سے فرشتہ وغیرہ مصنفین کی غلط بیانی ثابت ہوتی ہے، جنہوں نے لکھا کہ خلیفہ عبدالملک نے محمد بن قاسم کو سندھ سے پکڑوا کر اس لئے بانواع عقوبت قتل کر ڈالا کہ محمد بن قاسم نے راجہ داہر کی جن لڑکیوں کو حرم سرائے خلافت کے لئے بھیجا تھا، انہوں نے محمد بن قاسم سے انتقام لینے کے لئے خلیفۂ وقت عبدالملک سے جا کر یہ جھوٹی شکایت کی ''اے خلیفہ اب ہم تیرے کام کی نہیں، کہ محمد بن قاسم اس سے پہلے ہماری عصمت دری کر چکا ہے'' یہ سن کر خلیفہ بہت برہم ہوا

اور اس نے حکم دیا کہ ابن قاسم کو سندھ سے گرفتار کر کے لایا جائے اور اس جرأت رندانہ کے پاداش میں اس کا سر قلم کر دیا جائے، لیکن بلاذری، طبری وغیرہ عرب مورخین نے اس واقعہ کا ذکر تک نہیں کیا ہے۔ سندھ عبدالملک کے بعد فتح ہوا ہے اور ابن قاسم خلیفۂ سلیمان کے حکم سے گرفتار ہوا ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ حجاج کی اس سازش میں کہ سلیمان خلیفہ نہ ہوا، ابن قاسم بھی شریک تھا، اس لئے جب سلیمان خلیفہ ہوا تو اس نے شرکائے سازش کو پوری سزا دی، چوں کہ فارسی تاریخوں کی بدولت فتوحات سندھ کے سلسلے میں یہ کہانی لوگوں میں عام طور سے پھیلی ہوئی ہے (اس لئے یہ وضاحت ضروری معلوم ہوئی)

بہرحال محمد بن قاسم نے خلیفہ سلیمان کے عہد میں جب سندھ کو چھوڑا ہے تو وہاں اسلام کو کافی رونق ہو چکی تھی اور جیسا کہ پہلے ہم نے لکھا ہے کہ وہاں کے بودھوں اور برہمنوں دونوں میں اسلام پھیلنا شروع ہو چکا تھا، خلیفہ سلیمان کے بعد جب حضرت عمر بن عبدالعزیز خلیفہ ہوئے تو انہوں نے محمد بن قاسم کے ادھورے کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا چاہا۔ معلوم ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نہایت دین دار، زاہد، متقی، عدل پرور اور منصف خلیفہ تھے، ان کے سہ سالہ عہد خلافت میں اسلام نے وہی رونق حاصل کر لی تھی، جو خلافت راشدہ کے دور میں حاصل تھی، خلیفۂ اسلام حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عدل وانصاف، زہد واتقا اور حسن سیرت وحسن کردار کے افسانے ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلے ہوئے تھے اور حکومت اسلام کی غیر مسلم رعایا اسلام کے اس زندہ پیکر کو دیکھ کر اس کی طرف کھنچی چلی آ رہی تھی۔

سندھ کی غیر مسلم رعایا بھی اسی اثر میں دبی تھی اور اس کی کشش سے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتی چلی جاتی تھی، خود خلیفہ نے سندھ کے راجاؤں کے نام خطوط لکھے، ان کو اسلام کی دعوت دی، اس دعوت کو کامیابی حاصل ہوئی اور بعض راجاؤں نے خوشی خوشی اسلام کو قبول کیا، بلاذری اور کامل ابن اثیر میں ہے:

فكتب الى الملوك (ملوك السند) يدعوهم الى الاسلام والطاعة على ان يملكهم ولهم ما للمسلمين و عليهم ما عليهم و قد كانت بلغتهم سيرته و مذهبه فاسلم جيشه والملوك وتسموا باسماء العرب. (بلاذری طبع یورپ، ص:۴۴۴، کامل ابن اثیر، ج۵، ص:۴۰)

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سندھ کے راجاؤں کو خطوط لکھے، جن میں ان کو اسلام اور اطاعت کی دعوت دی، اس شرط پر کہ ان کی حکومتیں قائم رہیں گی، ان کے اور مسلمانوں کے تمام حقوق مساوی ہوں گے، ان لوگوں کے اس سے پہلے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے اخلاق اور مذہب کا حال معلوم ہو چکا تھا، اس پر داہر کا بیٹا جے شب (یا جے شیا) اور دوسرے راجہ مسلمان ہو گئے اور انہوں نے اپنے نام عربوں کے سے رکھے۔

پہلے زمانہ میں ایک بادشاہ کے تبدیل مذہب کا جو اثر رعایا پر پڑتا تھا وہ سب کو معلوم ہے، اس بنا پر سندھ کے ان راجاؤں کے قبول اسلام سے ان کی رعایا میں اسلام کی خاطر خواہ اشاعت ہوئی ہوگی۔

۱۰۵ھ میں خالد قسری عراق کا والی اور اس کی طرف سے جنید سندھ کا نائب مقرر ہوا، جنید نے ۱۰۷ھ میں کسی غرض سے چاہا کہ ایک فوج لے کر جے شیا کے ملک کو عبور کرے، راجہ کو خوف ہوا کہ وہ کہیں اس بہانہ سے ہمارے ملک پر قبضہ نہ کرلے، اس لئے اس نے آگے بڑھ کر روکا اور کہا کہ ہم لوگ مسلمان ہیں اور مجھے اس مرد صالح (حضرت عمر بن عبدالعزیز) نے یہاں کا والی بنادیا تھا۔ آخر طرفین نے ضمانت پیش کی، پھر مورخین لکھتے ہیں کہ راجہ مرتد ہوکر لڑنے پر آمادہ ہوگیا اور باہمی ضمانتیں ایک دوسرے کو واپس کردی گئیں، راجہ گرفتار ہوکر مارا گیا، اس کے بھائی چچ نے چاہا کہ کسی طرح وہ بچ کر عراق نکل جائے اور گورنر عراق خالد قسری کے سامنے اپنا مقدمہ اور جنید کی غداری کا واقعہ پیش کرے، لیکن جنید نے اس کو بھی دھوکہ سے قتل کروادیا۔

میرا خیال ہے کہ راجہ کے نفس لڑنے سے اس کے کفر وارتداد پر استدلال صحیح نہیں ہوسکتا، اگر ایسا ہوتا تو چچ کو کسی طرح عراق جا کر اپنا مقدمہ پیش کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی، بلکہ جنید نے اپنی کاروائی کو صحیح ثابت کرنے کے لئے یہ اختراع کیا ہوگا، جیسا کہ اس قسم کے واقعات حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی پیش آئے کہ ظالم امراء اور حکام اس وجہ سے کہ غیر مسلموں کے مسلمان ہوجانے سے جزیہ کی رقم کم ہوجاتی ہے، ایسا کرتے تھے کہ وہ نومسلموں سے بھی جزیہ کا مطالبہ کرتے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے زمانۂ خلافت میں اس خلافِ شریعت رسم کا قطعی سدباب کردیا، اس پر افسروں نے شکایت کہ کہ خزانہ خالی ہورہا ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جواب میں لکھا کہ محمد رسول اللہ داعی اور ہادی بن کر آئے تھے، محصل اور ٹیکس وصول کرنے والے بن کر نہیں آئے تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ۱۰۱ھ میں وفات پاجانے کے بعد رفتہ رفتہ پھر وہی بدعت شروع ہوگئی۔ خالد القسری والی عراق کے متعلق مشہور ہے کہ وہ دل سے مسلمان نہ تھا، اس کی ماں نصرانیہ تھی اور اس کا خود میلان مجوسیت کی طرف تھا، ایسی صورت حال میں اس کی ذات سے اسلام کو جو بھی صدمہ پہنچا ہو وہ کم ہے اور آخر میں اسی لئے وہ ۱۱۰ھ میں معزول کردیا گیا۔

❀ .... ❀ .... ❀

قسط (۱)

تفقہ فی الحدیث

اور

امام العصر حضرت علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ

مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ
سابق استاذ حدیث، جامعہ امام محمد انور شاہ، دیوبند

تفقہ فی الحدیث کا معنی

تفقہ فی الحدیث اپنے عمومی معنی کے لحاظ سے ذخیرۂ نبوی سے متعلق تمام تشریحات وتفصیلات کو شامل ہے، خواہ ان کا تعلق متن حدیث وظاہر حدیث سے ہو یا وہ حدیث کے درون، مفہوم ومعنی اور حکم وہدایت سے اعتناء کرتی ہوں، لیکن فقہ الحدیث کا اصطلاحی مفہوم اس سے بہت محدود ہے اور وہ صرف معنی حدیث، حدیث سے مستنبط احکام، مرادِ حدیث، منشائے حدیث اور درایتِ حدیث سے عبارت ہے۔ شراح ومحدثین کے نزدیک فقہ الحدیث یا تفقہ فی الحدیث اسی دوسرے خاص اور محدود معنی پر ہی بولا جاتا ہے۔ (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو: فقہ السنہ، مطبوعہ: دار الحدیث، قاہرہ اور فقہ السنہ ۲ جلدیں، مطبوعہ: مرکزی مکتبہ اسلامی، دہلی)

اس کے معنی عام کے لحاظ سے تو ہر عالم دین، ہر دور میں تفقہ فی الحدیث سے کچھ نہ کچھ حصہ رکھتا رہا ہے اور آئندہ بھی اس کی یہ حصہ داری قائم رہے گی۔ تاہم اصطلاحی اور معنی خاص کے تحت ہر دور میں چند ممتاز اور بالغ نظر شخصیات ہی کو یہ دولت بے بہا نصیب ہوئی۔ یہ حضرات اپنے اپنے زمانے کے افاضل واکابر اور عباقرہ کہلائے۔ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کی جماعت میں تقریباً تین درجن مرد وخواتین تفقہ فی الحدیث یا درایتِ حدیث میں امتیازی مقام ومرتبہ کے حامل ہوئے۔ ان میں حضرات خلفائے راشدین، حضرت زید بن ثابت، حضرات عبادلۂ ثلاثہ اور حضرت عائشہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔ مقالہ کی تنگ دامانی کے باعث ان سبھی چھتیس صحابہ وصحابیات کے درایتِ حدیث کی بابت اقوال وآثار درج نہ کرکے،

صرف حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت عائشہؓ سے منسوب و منقول آثار و ارشادات نقل کئے جا رہے ہیں:

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت کی گئی ہے:

"قال النبي صلى الله عليه وسلم كلمة، و قلتُ آخرى. قال النبي صلى الله عليه وسلم: من مات وهو يدعو من دون الله نِدًّا دخل النار. و قلت: من مات وهو لايدعو لله ندًّا دخل الجنة." (صحیح بخاری،۲/۶۴۶، باب قولہ: ومن الناس من يتخذ من دون الله أنداداً، کتاب التفسیر)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو شخص اس حال میں مرے کہ غیر اللہ کو شریک و سہیم پکارتا ہو، وہ جہنم میں جائے گا۔ اس سے استفادہ کرتے ہوئے میں (ابن مسعود) نے کہا جو اس حال میں مرے کہ وہ کسی کو اللہ کا شریک نہ پکارتا ہو، وہ جنت میں داخل ہوگا۔ **قلت: من مات الحديث** حضرت ابن مسعودؓ کے تفقہ فی الحدیث اور درایت حدیث پر دال ہے۔ اسی طرح صحیح بخاری میں ہی حضرت عائشہؓ کے حوالے سے منقول ہے، عروہ بن زبیر کہتے ہیں:

"ذُكر عند عائشة أن ابن عمر رفع إلى النبي صلى الله عليه وسلم أن الميت يعذّب في قبره ببكاء أهله، فقالت: إنما قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: إنه ليعذب بخطيئته و ذنبه، و إن أهله ليبكون عليه الآن." (صحیح بخاری،۲/۵۶۷، باب قتل أبي جهل، كتاب المغازي)

کہ حضرت عائشہؓ سے ذکر کیا گیا کہ حضرت ابن عمرؓ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کر کے کہتے ہیں کہ میت کو اس کے اہل خانہ کے رونے کے سبب قبر میں عذاب دیا جاتا ہے۔

اس پر حضرت عائشہؓ نے فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تو یہ فرمایا کہ میت کو اس کی خطا اور ذنب کے سبب عذاب دیا جاتا ہے اور اس کے اہل خانہ اب اس پر روتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کا قول **إنما قال رسول الله** ﷺ سے ان کی حدیثی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

علمائے حدیث کے دو طبقے

فقہ الحدیث، درایتِ حدیث اور حدیثی بصیرت کا یہ سلسلہ عہد صحابہؓ کے بعد بھی جاری رہا، بلکہ ان حضرات کی مساعی جمیلہ اور حلقۂ ہائے درس و تدریس کے فیض و برکت سے پہلے سے زیادہ فروغ پایا۔ چنانچہ عہد تابعین میں سیکڑوں شخصیات اس حوالے سے اعتبار و استناد کا درجہ رکھتی ہیں۔ اسی طرح تبع تابعین کے دور میں بھی اسلامی مملکت کے ہر خطے و علاقے میں، فقہ الحدیث اور درایت حدیث کے اعلام و عباقرہ پائے گئے۔ یہی وہ مبارک عہد ہے جب حدیث نبوی کی باضابطہ تدوین ہوئی اور اس مقدس علم کی شاخ

درشاخ تقسیم کا وجود ہوا، نیز ہر ایک قسم میں با کمال اور ماہر علماء ومحدثین پیدا ہوئے۔ابتدائی واجمالی طور پر حدیث نبوی کی جو تقسیم پورے آب وتاب اورشان بان کے ساتھ جلوہ گر ہوئی وہ الفاظ حدیث اور معانی حدیث پر مشتمل تھی۔اس کو دوسرے لفظوں میں روایتِ حدیث،متنِ حدیث یا ظاہر حدیث اور درایتِ حدیث،معنیٔ حدیث اوردرونِ حدیث سے تعبیر کیا گیا۔اس طرح ارشادنبوی ''**لکل آیة منها ظهر و بطن**''(تفصیل کے لئے ملاحظہ کوفقہ ''أهل العراق و حديثهم''تالیف:علامہ زاہدالکوثری مصریؒ)

کامحمل ومصداق جلی تر ہوکرسامنے آیا۔اس میں سے پہلے حصہ سےاعتناء واشتغال رکھنے والوں کواہل الحدیث، اہل الحجاز یا محدث کہا گیا، جب کہ دوسری شاخ میں امتیاز کی حامل شخصیات کواہل الرائے ، اہل العراق یا فقیہ کے ناموں سے یاد کیا گیا۔ یہ دوا لگ الگ نام ان حضرات کی غالب دل چسپی اورزیادہ اعتناء واشتغال کے پیش نظر دیا گیا۔ورنہ اہل الحدیث کے طبقے میں اہل فقہ وتفقہ کی کوئی کمی نہیں۔اسی طرح اہل الرائے میں سے کسی کا دامن احادیث نبوی کے ذخیرہ سے خالی نہ رہا۔(مشکوۃ،ا رکتاب العلم،ص:۳۵)

تفقہ فی الحدیث میں ممتاز علمائے دیوبند

الغرض تفقہ فی الحدیث یا فقہ الحدیث میں امتیازی مقام ومرتبہ پر فائز عظیم شخصیات کے وجود با مسعود سے یہ دنیا کبھی خالی نہ رہی۔اتنا ضرور ہے کہ زمانہ عہد نبوت سے جس قدر دور ہوتا گیا، اسی قدر اس کی برکات بھی گھٹتی اورسمٹتی گئیں۔ماضی قریب میں برصغیر میں خانوادۂ ولی اللّٰہی کے عباقرہ روزگار شخصیات اور شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کے علاوہ ان کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ میں بہت سے حضرات میں فقہی بصیرت بہت نمایاں طور پر پائی جاتی ہے۔ان میں قطب الارشاد مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ،حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوریؒ، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ، شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ اور امام العصر حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ بہت ممتاز اور معروف ہیں۔زیر مطالعہ تحریر میں موخر الذکر شخصیت کی فقہی بصیرت اور فقہ الحدیث میں ان کے امتیاز پر شواہد وامثلہ کی روشنی میں گفتگو کی جائے گی۔وباللہ التوفیق

علامہ کشمیری، اصولِ حدیث کی دریافت

ذخیرہ احادیث میں بظاہر تعارض اور اختلاف کی مثالیں بڑی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔حضرات محدثین نے اس رفعِ تعارض کے حوالے سے کئی ایک اصول وضوابط وضع کیے،جن کی مدد سے یہ اختلاف،

حقیقی کی جگہ محض ظاہری اور لفظی اختلاف بن کر رہ گیا۔ کشمیری الامام نے اپنی ژرف نگاہی، وسعتِ مطالعہ اور قوتِ حافظہ سے احادیث پر گہری نظر ڈالی تو رفعِ تعارض کی کچھ نئی راہیں دریافت ہوئیں اور وہ اس باب میں بیش قیمت لعل و جواہر باہر نکالنے میں کامیاب رہے۔ اگر چہ ان راہوں کے دھندلے سے نقوش پہلے سے پائے جاتے تھے، مگر ان کو واضح نشانِ منزل کشمیری الامام نے بنایا۔

۱- کلٌّ روَی بما عَلِمَ : کشمیری الامام نے طویل غور و خوض اور متعدد نظائر و امثلہ پر نظر کر کے ایک اصول وضع کیا جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہر شخص نے وہ بات بیان کی جس کا اسے علم تھا۔ وہ اس بات کے مالہ و ماعلیہ اور پس و پیش کی اور تحقیق کھود کرید کے درپے نہ ہوا۔ یہ اصول احادیث کے باب میں رفعِ تعارض کے حوالے سے کتنا اہم اور مفید ہے، یہ کسی صاحب نظر سے مخفی نہیں۔ دو مثالیں درج کی جارہی ہیں۔

☆ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کل غزوات کی تعداد کے بارے میں چار روایات منقول ہیں: صحیح بخاری میں کتاب المغازی کی پہلی حدیث میں حضرت زید بن ارقمؓ سے انیس غزوات منقول ہیں۔ مسند ابویعلی میں بروایت حضرت جابر بن عبداللہؓ اکیس کی تعداد مذکور ہے۔ مصنف عبدالرزاق میں بہ روایت حضرت سعید بن مسیّب غزوات کی تعداد چوبیس ذکر کی گئی ہے۔ جب کہ مشہور صاحب سیر ابن سعد نے طبقات میں ستائیس کی تصریح کی ہے۔ اگر کسی کو مذکورہ بالا اصل وضابطہ کا علم ہو تو اسے ان روایات میں ہرگز کوئی تعارض معلوم نہ ہوگا ورنہ تو بہت مشکل ہے ڈگر پنگھٹ کی۔

☆ صلح حدیبیہ میں حضرات صحابہ کرامؓ کی تعداد کی بابت حدیث و سیر کی کتابوں میں تین طرح کی روایات پائی جاتی ہیں۔ تیرہ سو، چودہ سو اور پندرہ سو۔ یہ اختلاف وتعارض بھی مذکورہ ضابطہ واصل کی روشنی میں بہ سہولت رفع ہو جاتا ہے۔ (ان دونوں میں اختلافِ تعداد کی بابت مذکورہ کتابیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں)

۲- استعمال كلمة على عكس المعهود : عربی زبان میں کوئی لفظ فعل یا اسم ایک طرح سے شائع وذائع ہو۔ پس اگر کتاب وسنت میں کسی جگہ اس معہود کے برعکس استعمال ہو تو اس سے متبادر مفہوم سے ہٹ کر کسی دوسرے معنی کی طرف اشارہ مقصود ہوتا ہے۔ اس کی قرآن وحدیث سے صرف ایک ایک مثالیں ملاحظہ ہوں:

☆ خانۂ کعبہ کی حضرت ابراہیم وحضرت اسماعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام کے ذریعہ تعمیر جدید کے موقع پر قرآن کریم کی تعبیر ہے ”وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرَاهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمَاعِيْلُ“ (سورہ بقرہ، آیت:۱۲۷)

ابراہیم واسماعیل کو ایک ساتھ نہ ذکر کر کے ان کے درمیان ”القواعد من البيت“ سے فصل کیا گیا۔ جب کہ قرینِ عقل و إذ يرفع ابراهم وا سماعيل القواعد من البيت ہے۔ اس معہود کے برعکس کرنے میں اس جانب اشارہ مقصود ہے کہ دونوں ایک درجہ میں تعمیر میں شریک نہیں، بلکہ ابراہیم اصل

اور معمار تھے، جب کہ اسماعیل تابع اور مزدور۔ اگر ایک ساتھ ذکر کیا جاتا تو اس پہلو کی طرف اشارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ (دیکھئے کتبِ تفسیر، نیز مشکلات القرآن، تالیف: امام العصر الکشمیری)

☆ لفظ قراءۃ عربی زبان میں اپنے معمول منصوب ومفعول بہ کی طرف براہِ راست متعدی ہے، نہ کہ کسی حرف کے واسطے سے۔ کہا جاتا ہے **قرأت الکتاب، قرأت الدرسَ** وغیرہ جب کہ بعض روایات میں اس کا تعدیہ حرف ''ب'' سے کیا گیا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں حضرت ام سلمہؓ سے روایت ہے:

''طفتُ وراء الناسِ والنبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم یقرأ بالطور''

(صحیح بخاری، ۱۰۶/۱، **باب الجهر بقراء ة صلاة الفجر**)

اسی طرح صحیح بخاری میں ہی جبیر بن مطعم اپنے والد حضرت مطعم بن عدیؓ سے روایت کرتے ہیں:

''سمعتُ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قرأ فی المغرب بالطور.''

(ایضاً، ۱۰۵/۱، **باب الجهر فی المغرب**)

نیز غزوۂ احد کی تفصیلات کے ذیل میں خارجہ بن زید حضرت زید بن ثابتؓ سے نقل کرتے ہیں:

''فقدتُ آیة من الأحزاب حین نسخنا المصحف کنت أسمع رسول اللّٰہ ﷺ یقرأ بها، فوجد ناها مع خزیمة بن ثابت الأنصاری'' (ایضاً، ۵۸۰/۲، **باب غزوة احد**)

علاوہ ازیں بعض دوسری روایات میں بھی قراءۃ کو ب کے ساتھ لایا گیا ہے۔ کشمیری الامام کہتے ہیں کہ ایسا وہاں کیا جاتا ہے جب یہ بتانا مقصود ہو کہ مفعول بہ یہاں بعض مفعول ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ کوئی دوسرا بھی مفعولیت میں شریک ہے۔ جب کہ بغیر ب کے تعدیہ کا معنی یہ ہوتا ہے کہ مفعولیت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ ان سب روایات میں جن میں مفعول بہ کی جانب تعدیہ بواسطہ ب ہے، مقروء ہی صرف مفعول بہ نہیں ہے بلکہ سورۂ طور، سورۂ احزاب کی اس آیت کے ساتھ دوسری سورت وآیت بھی مقروء ہے۔ پس ترمذی شریف کی روایت: **''لا صلاة لمن لم یقرأ بفاتحة الکتاب''**

(سنن ترمذی، ابواب الصلاۃ، **باب ما جاء أنه لا صلاة إلا بفاتحة الکتاب**)

میں مفعول بہ پر ب داخل ہے، لہٰذا اس سے اس امر کی جانب اشارہ مقصود ہے کہ نماز میں صرف سورۂ فاتحہ نہیں پڑھی جائے گی، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ دوسری سورت بھی پڑھی جائے گی، یعنی ضم سورت بھی کیا جائے گا۔ پس معلوم ہوا کہ اس حدیث شریف سے قراءۃ خلف الامام کی فرضیت پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ہر رکعت میں ضم سورت کی فرضیت بھی لازم ہوگی۔ (اس ضابطہ واصل کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو: فصل الخطاب فی مسئلۃ أم الکتاب، تالیف: امام العصر الکشمیری؛ اور معارف السنن، تالیف: حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ) (جاری)

❁ .... ❁ .... ❁

تاریخ بابل

مولانا ابوالجلال صاحب ندویؒ

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں میں سے ایک کا نام احیاہ تھا، سفر ملوک میں اسی کو نبی بتایا گیا ہے۔ حضرت سلیمانؑ کی زندگی ہی میں اُس نے اُن کے ایک نوکر کو حضرت سلیمانؑ سے ان پر کفر و شرک کا الزام لگا کر بہکایا کہ ان کے خلاف بغاوت کردو، بریعام نے بغاوت کی، ناکام رہا اور مصر بھاگ گیا، ان کی وفات کے بعد وہ مصر سے واپس آیا اور بنی اسرائیل کے دس قبیلوں کو بریعام نے خاندانِ سلیمان سے توڑ لیا، پانچ برس بعد فرعون مصر شبشق نے یروشلم پر چڑھائی کی اور اس کو لوٹ مار کر چلا گیا، اس سے بریعام کی حکومت مستحکم ہوگئی، کچھ عرصہ بعد بریعام نے اپنے زیراثر بنواسرائیل کو بہکا کر پھر سے دین سامری کو رواج دیا اور بنواسرائیل کا یہ طبقہ بچھڑا پوجنے لگا۔

یہ واقعہ سفر ملوک (۱۰، ۱۹، ۲۹، ۴۰ و ۱۲، ۲۰، و ۱۴، و ۲۵) اور سفر ایام میں بہ تشریح مذکور ہے۔

عرب کے اندر آغاز اسلام میں ایسے بنی اسرائیل بھی تھے جو حضرت سلیمانؑ کی بابت احیاہ کے فتویٰ پر ایمان رکھتے تھے، آں حضرت ﷺ کی نبوت پر اعتراض کرتے ہوئے اخیاہ کو نبی ماننے والے چند اہل کتاب نے کوئی ایسی بات کہی جس کے جواب میں خدا نے فرمایا:

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْت. (سورہ بقرہ)

اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تصدیق بھی کررہے ہیں اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے، ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دیا جیسے گویا اصلاً علم ہی نہیں اور انہوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا، جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں۔ اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے اور حالت یہ تھی کہ یہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے اور اس کا بھی جو ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا

بابل میں جن کا نام ہاروت وماروت تھا۔

حضرت سلیمانؑ کے حالات سفر ملوک اور سفر ایام کے مؤلفوں نے ناتن بنی کی کتاب اور سیلانی اخیاہ کی پیشین گوئیوں اور عبد دینی کی روایتوں کی کتاب سے نقل کئے ہیں (سفر ایام ۹-۲۹) یہ کتابیں اب ناپید ہیں، حضرت سلیمانؑ پر اہل کتاب کے کفر کا فتویٰ دراصل سیلانی اخیاہ کی کتاب کا اعادہ تھا، یہ کتاب نزول قرآن کے زمانہ تک موجود تھی اور کلام اللہ سمجھ کر اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اسی کتاب کا ذکر قرآن کی اس آیت میں **ما تتلوا الشياطين** کے لقب سے آیا ہے۔اس آیت میں خدا نے بتایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نہیں بلکہ اُن پر کفر کا فتویٰ لگانے والے شیاطین خود کافر تھے، اُن کے کافر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو سحر کی اور ہاروت اور ماروت کے لٹریچر کی تعلیم دیتے تھے۔

ہاروت اور ماروت کی ہستیوں اور ان کے لٹریچر پر بحث کا یہ محل نہیں ہے، یہ فرشتے کہلانے والے اشخاص بابل کے باشندے تھے۔

وجہ تسمیہ

بابل کو یہ نام کیوں دیا گیا؟ اس سوال کے جواب مختلف دیئے گئے ہیں، یاقوت نے معجم البلدان میں لکھا ہے:"**قال ابو المنذر هشام بن محمد و مدينة باب بناها بيوراسب الجبار واشتق اسمها من اسم المشترى لان بابل باللسان البابلى الاول اسم المشترى**"

ابوالمنذ رہشام بن محمد نے کہا کہ بابل کا بانی بیوراسب جبار تھا، بابل کی پرانی زبان میں مشتری کو بابل کہتے تھے،اسی کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا۔

بانی بابل کا نام بیوراسب غالباً ایران کی کہانیوں سے ماخوذ ہے، پرانی کلدانی میں بابل مشتری کو کہتے تھے یا نہیں، اس کا ہم کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، یہ بات یاقوت نے تذکرہ بابل میں کہی ہے۔فسطاط مصر کا ایک زمانہ میں کسی وجہ سے بابلیون نام تھا، بابلیون کے ذکر میں یاقوت نے لکھا ہے:"**ذكر اهل التوراة ان مقام آدم عليه السلام كان بابل فلما قتل قابيل هابيل مقت آدم قابيل فهرب قابيل باهله الى الجبال عن ارض بابل فسميت بابل يعنى الفرقة**"

اہل توراۃ کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام بابل میں رہتے تھے، جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تو آدم علیہ السلام قابیل سے نفرت کرنے لگے اور قابیل پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا،اس لئے اس کا نام بابل یعنی

جدائی رکھا گیا۔

معلوم نہیں اہل تورات کا یہ قول یاقوت نے کہاں سے نقل کیا ہے۔سفر تکوین میں یہ ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم کے اسلاف اس دیار میں قدم سے آئے ،اُن کے یہاں آنے سے پہلے **وھی کل ارض شفیتم احدیم دوبریم احدیھم.**

ساری زمین ایک ہونٹ اور یک بولی تھی۔

یہاں پہنچنے کے بعدان لوگوں نے ایک برج بنانا چاہا،خدا کو یہ ارادہ ناگوار گذرا،اس لئے خداوند نے ان کی بولی بات میں اختلاف ڈال کران کو تمام روئے زمین میں پراگندہ کیا،سووہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے۔ یہ واقعہ نقل کرکے سفر تکوین کے جامع نے لکھا ہے کہ ’’اس لئے اس کا نام بابل (اختلاف) پڑا کیوں کہ خداوند نے وہاں ساری زمین کی زبانوں میں اختلاف (ببل) ڈالا اور وہاں سے اُن کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔(تکوین ۱۱: ۱تا۹)

یاقوت نے ابوبکر احمد بن مروان المالکی الدنیوری کی کتاب المجالس کے حوالہ سے تقریباً یہی قصہ حضرت انس بن مالکؓ کی طرف منسوب کیا ہے،جس میں انہوں نے اخیر میں فرمایا ہے کہ پھر لوگ بہتر زبانیں بولنے لگے۔

و تبلبلت الالسن فسميت بابل.

اورزبانیں گڈمڈ ہوگئیں،اس لئے اس کا بابل نام پڑا۔

کسی عمارت کی تعمیر اختلاف السنہ کا سبب نہیں ہوسکتی،جس عمارت کی تعمیر کے عزم کا توراۃ میں ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ بولی بات میں اختلاف کی بدولت وہ اس عمارت اور شہر کی تعمیر سے باز رہے، بعد میں ان لوگوں میں جو یہیں رہ گئے اسے بنایا،اس عمارت کا نام سمیری زبان میں تنتز کی کا دنجر (دیوتا کا آستانہ) تھا، اسی کا ترجمہ یہاں کے سامی باشندوں نے باب ایل (خدا کا پھاٹک) اور باب ایلون (خداؤں کا پھاٹک) کیا، جو مختصر ہوکر بابل ہوگیا۔ یہ پہلے اسی برج کا نام تھا، جسے توراتی بیان کے مطابق تعمیر کرنے کے عزم کی بنا پر خدا نے وہاں والوں کی بولی بات میں اختلاف ڈالا، پھر بتدریج یہ نام اس شہر کا جس میں یہ عمارت تھی اور اس کے بعد اس پورے علاقہ کا نام ہوگیا،جس پر شاہانِ شہر بابل حکومت کرتے تھے،توراۃ میں جس قسم کی بولی بات کے اتحاد اور اختلاف کا ذکر ہے، وہ مذہبی کلمہ کا اتحاد اور مذہبی کلمہ کا اختلاف ہے، اس بولی بات کے اختلاف کی نظیر بابل کے دو بادشاہوں کے ناموں میں ملتی ہے۔

ایک شاہ بابل کا نام تھا سا موابی یعنی میرا باپ سام ہے، اس نام میں کوئی بات ایسی ہے جس سے ایسے نام خدا کو ناپسند تھے، چنانچہ توراۃ کے بیان کے بموجب حضرت ابراہیمؑ کا نام جواُن کے باپ نے رکھا تھا، وہ ابی رام تھا (میرا باپ رام ہے) خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ یہ نام بدل دو اور آج سے تمہارا نام ابی رام نہیں، بلکہ اب راہام ہوگا، حضرت ابراہیمؑ کا نام جس سبب سے خدا نے بدلوایا، اس کو سمجھنے کے لئے حضرت یرمیاہ کے صحیفہ میں خدا کا ارشاد پڑھو۔

''جس طرح چور جب پکڑ لیا جاتا ہے رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانا اوران کے بادشاہ اور امیر اور کاہن اور (جھوٹ موٹ کے) نبی رسوا ہوں گے، جو کاٹھ سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے اور پتھر سے کہ تو نے مجھے جنا ہے۔ انہوں نے میری طرف رخ نہیں بلکہ پشت پھیر رکھی ہے مگر مصیبت کے وقت کہیں گے اٹھ اور ہمیں بچا۔ (یرمیاہ۲: ۲۶، ۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابی رام اور سا موابی جیسے نام رکھنے کا مطلب اس عقیدہ کا اعلان تھا کہ راموایلو (رام ایک خدا ہے) اور سا موایلو (سام ایک خدا ہے) اب سا موابی کے نام کا مطلب سمجھنے کے بعد اس کے ایک جانشین کا نام سنو، سا مولوایلو (سام خدا نہیں ہے) اس قسم کے بہت سے نام باشندگان بابل کے پیش کئے جاسکتے ہیں، مثلاً بل بالی (بعل خالق ہے) اور یابنی (یا خالق ہے) ان ناموں سے ظاہر ہے کہ بابل میں جا کر بسنے کے بعد وہاں والوں میں جس قسم کا اختلاف اُن کی بولی بات میں پڑا تھا وہ مذہبی اختلاف تھا اور اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے بابل کو باب ایل نہ ماننے والوں نے اسے بدل کر بیل بنا دیا اور اب اس نام کے معنی طرح طرح کی بولی بولنا ہو گئے، بابل کی توراتی وجہ تسمیہ کو جدید تحقیقات کی روشنی میں غلط نہیں کہنا چاہئے بلکہ اسے ترمیم اسم کی وجہ قرار دینا چاہئے، بابل کے مندر کو باب ایل تسلیم کرنا سفر تکوین کے جامع کے لئے ناممکن تھا، اس لئے اختلاف کلمات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس شہر کے نام میں ترمیم کی گئی۔

محل وقوع

بابل عراق کے ایک شہر کا نام ہے، عراق دریائے دجلہ وفرات کی درمیانی وادی کا نام ہے، عرب کے نقشہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ طول بلد ۴۸، و ۵ اور عرض بلد ۳۰ تک خلیج فارس، ایران وعرب کے درمیان گھسی ہوئی ہے، جس میں دریائے دجلہ وفرات گرتے ہیں، جو واسط کے پاس پہنچ کر ایک ہو جاتے ہیں، واسط سے شمال کی جانب طول بلد ۴۵ اور عرض بلد ۳۸ کے پاس فرات کے مغربی کنارہ پر ایل مقام

واقع ہے، جوتل نمرود کہلاتا ہے، اسی مقام کا نام بابل تھا، جسے عرصہ دراز کی بول چال نے دوآبہ دجلہ وفرات کے ثلث زیرین کا نام بنادیا تھا۔

باشندگان بابل

بابل کی وجہ تسمیہ میں ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہی مقام آدم کا ابتدائی مسکن تھا، جہاں سے قابیل جبال نود کو بھاگا تھا، یہ قول قابل استناد نہیں ہے۔ یاقوت نے لکھا ہے: **و یقال ان اول من سکنها نوح علیه السلام وهو اول من عمرها و کان نزلها بعقب الطوفان.**

اور کہا جاتا ہے کہ بابل میں سب سے پہلے حضرت نوح آباد ہوئے اور یہاں وہ طوفان کے بعد آئے۔

قرآن مجید کے بیان کے مطابق جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی اس کا نام جودی ہے اور توراتی نام اس پہاڑ کا اراراط ہے، آشوری روایت کے مطابق اس پہاڑ کا نام نسر تھا (دیکھئے بحث جودی) حضرت نوحؑ اور ان کے اصحاب کشتی اسی پہاڑ کے آس پاس بسے ہوں گے، یہ آرمینیہ میں واقع ہے۔ حضرت نوح کا بابل میں آباد ہونا مشکل سے یقین کیا جاتا ہے مگر آشوری افسانہ ازدبار میں جس کا تذکرہ قصہ نوح میں کیا گیا ہے طوفان سے پیشتر حضرت نوح کا آشوری نام تاسیت ناپشتم (شیث کامل) تھا، شرشور پاک کے باشندے دراُباراتوتو (قوم اُبار) کے فرزند تھے، یہ شہر خود اس افسانہ کے مطابق ''ساحل فرات'' پر واقع تھا، غالبًا اسی روایت نے بعد میں یہ صورت اختیار کرلی کہ حضرت نوح کا مسکن بعد طوفان بابل میں تھا، توراۃ کے بیان کے مطابق بنی نوح جو اس دیار میں بسے یہاں کے قدیم باشندے نہیں تھے بلکہ وہ اس دیار میں قدم سے آئے۔

''اور جب وے قدم سے روانہ ہوئے تو ایسا ہوا کہ انہوں نے شنعار کے ملک میں ایک میدان پایا اور وہیں رہ پڑے) (تکوین ۱۱:۲)

اسی ملک شنعار کے اس حصہ کا جس میں بنی نوح یا بالفاظ دیگر اسلاف ابراہیم علیہ السلام آباد ہوئے دوسرا نام بابل ہے۔ (تکوین ۱۱:۹)

توراۃ کی اس آیت میں میدان کی بجائے اصل عبرانی لفظ ''قاعۃ'' ہے، قاعہ چٹیل میدان کو کہتے ہیں، جہاں نہ آدم ہو نہ آدم زاد اور وہاں نہ درخت ہو اور نہ کوئی اور سایہ دار چیز، بنی نوح یا اسلاف ابراہیم علیہ السلام یہاں ایسے زمانہ میں آئے جب یہ علاقہ غیر آباد تھا۔

حضرت ابراہیم کے اسلاف میں ایسے افراد بہت گذرے ہیں جو اپنے نام ''ساموابی'' جیسے رکھتے تھے، اس

لئے وہ بنوسام کہلائے، ان لوگوں کے یہاں آنے کے بعد لیکن اُن کے برسر عروج آنے سے پہلے ایک اور قوم اس دیار میں آبسی جس کی زبان اور طرزِ زندگی کے علاوہ صورت شکل بھی مختلف تھی، آثارِ باقیہ کے علماء نے اس قوم کو سمیریون کا نام دیا ہے۔ سفر تکوین کا جامع اور اس کے اتباع میں بعد کے عرب مورخین تمام اقوام عالم کو حضرت نوحؑ کے تین بیٹوں کی اولاد بتاتے ہیں جن میں سے ایک تو بنوسام کا مورث تھا سام، ایک بیٹے کا نام حام تھا، دراصل یہ نام مصری لفظ خم کی عبرانی صورت ہے، خم سرزمین مصر کا نام تھا کیوں کہ وہاں کی زمین سیاہ ہے اور خم کے معنی ہیں کالی مٹی، رفتہ رفتہ یہ اہل مصر اور ان کے ہم نسلوں کے مورثِ اعلیٰ کا نام ہوگیا، تورات کے بیان کے مطابق بنوحام بھی ابتداء میں سرزمین بابل میں رہتے تھے، پھر مصر وغیرہ میں جا بسے، تیسری قوم کا توراتی نام بنو یافث ہے، یہ بھی ابتداء میں بابل میں رہتے تھے، ان بابلی بنو یافث کو ہم آثارِ قدیمہ کی سمیری قوم سے تطبیق دے سکتے ہیں۔

حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ شنعار میں جو کہ بعد میں ارضِ بابل یا کلدانیون کی سرزمین کہلایا، ابتداء میں تین قومیں آباد تھیں (۱) بنو یافث (۲) بنوحام (۳) بنوسام۔

لیکن بابلی آثار قدیمہ کے علماء اس علاقہ کی دو ہی قوموں کو جانتے ہیں، جن میں سے ایک سومیری قوم تھی اور ایک سامری، لیکن توراۃ کے بیان کو بالکل بے اصل نہیں کہا جاسکتا۔ اور کی حکومت کے قیام سے پہلے کش نام ایک شہر میں مسیلم نام کا ایک فرماں روا تھا، جس کے جانشینوں کا راج عروج وزوال کے ساتھ ۴۴۰۰ سے ۳۱۰۰ ق م تک قائم رہا، یہ خاندان سامی النسل تھا۔ ۴۵۰۰ ق م ۲۱۰۰ ق م تک شہر میں لاء نام ایک شہر میں جس کو جرسو، ٹن جرسو اور سنجر بھی کہا جاتا تھا، ایک بادشاہ اور کاجنا اور اس کے جانشین راج کرتے تھے۔ ان بادشاہوں کو سیمیرین قوم سے بتایا گیا ہے۔ مسیلم کے برسر عروج آنے سے پہلے ۴۵۰۰ ق م میں ایک شاہ کنجی گذرا ہے، جس نے مسیلم کے پیش رو حکام کش کو شکست دے کر یہاں کا مال غنیمت آثارِ قدیمہ کی شہادت کے مطابق "زمینوں کے خداوندانِ لیل" کی خدمت میں نذر پیش کیا تھا، اس بادشاہ کی بابت ہسٹورٹیس ہسٹری آف دی ورلڈ کی پہلی جلد کے مولف نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس یہ بتانے کے لئے مواد موجود نہیں ہے کہ وہ کس قوم سے تھا، سامی تھا یا سمیری تھا۔

لیکن اس کا نام تھا، ان شگ کوش انا، جو چار لفظوں کا مجموعہ ہے۔

(۱) شگ ماسگ = سردار (۲) انا = آسمان رتبہ (۳) ان-آقا (۳) کوش = یہ نام توراتی کوش بن حام کے نام سے ملتا جلتا ہے، جس کے فرزند نمرود کی بابت توراۃ میں ہے کہ اس کی حکومت کی ابتداء شنعار کی سرزمین میں بابل ارک، اکاداور کلنہ میں ہوئی مگر پھر وہ اشور کو نکل گیا اور نینویٰ احباب عبر اور کلح کو بنایا اور نینویٰ اور رسح کے درمیان اس کی تعمیر کی جو بڑا شہر ہے۔ (تکوین ۲۰:۱۰ تا ۱۲)

چوں کہ بنو حام بالکل ابتدائی زمانہ میں اس دیار سے نکل گئے تھے، اس لئے اس کے نشانات یہاں نہیں ملتے مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دیار میں پہلے تین قومیں آباد تھیں، ان تینوں کو سفر تکوین کے جامع نے حضرت نوحؑ کی اولاد بتایا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ کہاں تک درست ہے کہ تمام زبانیں بولنے والی دنیا بھر کی تمام قومیں حضرت نوحؑ کی اولاد ہیں۔ بنو سام یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلاف اس دیار میں قدم سے آئے تھے، قدم کے لغوی معنی سامنے کے ہیں۔ مصر والے مشرق کو قدم کہتے تھے، توراۃ پر مصری محاورہ کا کافی اثر ہے، قدم توراۃ میں خصوصیت کے ساتھ عرب کا نام ہے دوآبہ فرات وخابور کے علاوہ پورے عرب کو بشمول آرمینیہ جہاں دجلہ وفرات کے سرچشمے واقع ہیں، توراۃ میں قدم کہا گیا ہے جس قوم کو سمیری کہا جاتا ہے، ہمارے خیال میں اسی کا قرآنی نام یاجوج اور ماجوج ہے۔

افسانوی تاریخ

قرآن مجید کی جس آیت میں بابل کا ذکر ہے نہ صرف اُس کے بلکہ قرآن مجید کے اکثر قصوں کے فہم کے لئے ابتداء سے بنی اسرائیل کی اسیری بابل کے عہد تک دوآبہ دجلہ وفرات کی اجمال کے ساتھ پوری تاریخ دینا زیادہ مفید ہوگا، ہر قوم خصوصاً ایسی قوم کی تاریخ جس کا زمانہ عروج فنِ تحریر کی ایجاد سے پہلے گذرا ہو خلافِ عقل کتھاؤں سے شروع ہوتی ہے، ان کتھاؤں میں زمانہ دراز کی بھول بھلیوں اور شاعروں کی بلند پروازیوں نے بہت مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن ہر پرانی کتھا اپنے اندر قدیم تاریخ کو چھپائے ہوئے ہے۔

اہل بابل کی ایک کتھا کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتداء میں دو ہستیاں تھیں جن کے نام ہیں ابسو اور تیامت یہ دونوں میاں بی بی تھے، ان سے نحمو اور نحامو پیدا ہوئے، جو انشر اور کیشر کے والدین تھے، ان دونوں نے انو، بل اور یا وغیرہ دیوی دیوتاؤں کو جنم دیا، ان دیوی دیوتاؤں سے ناراض ہو کر تیامت نے چند شریف ہستیوں کو چن کر اُن کا امیر کنجو کو مقرر کیا اور کنجو کی فوج دیوتاؤں سے ان کی خدائی چھیننے کو چلی، اس کی خبر انشر کو ہوگئی، اس نے اپنے ایلچی جاجا کو بھیج کر دیوتاؤں کو متنبہ کیا، چنانچہ مردوک اُن سے لڑنے کو اترا اور اس نے تیامت کو چیر کر دو حصے بنا دیئے، جن سے آسمان اور زمین پھر سیارے اور انسان وجود پذیر ہوئے۔ (ہسٹورینس ہسٹری آف دی ولرڈ، ج ا، ص: ۵۲۰)

اس افسانہ کے اندر قدیم تاریخ موجود ہے، قدیم زمانہ میں عرب کو خالدیہ والے ماتی تیامت، (ارض البحر) کہتے تھے، لخم عرب میں ایک خاص قسم کی مچھلی کو کہتے ہیں، اس لئے ماتی تیامت یعنی ارض البحر کے قدیم باشندے لخم کہلائے، یہ بنو لخم جب اس سرزمین میں پہنچے جس کا قرآنی نام بابل ہے تو وہ انشر اور کیشر بن

گئے، یہاں انہوں نے انو، بل اور یا وغیرہ بہت سے دیوتاؤں کو جنم دیا اور وہ مشترک اور متعدد دیوتاؤں کے قائل ہو گئے، اس وقت کنجو نام ایک رئیس کے ماتحت تیامت یعنی ارض البحر کے رہنے والے ایک دوسرے گروہ نے دیوتاؤں کی خدائی سے محروم کرنے کی جدوجہد شرع کی، ان دونوں گروہوں میں جنگ ہوئی، ایک گرہ کا رئیس کنجو تھا، دوسرے کا مردوک، مردوک کے گروہ میں ایک تیسرا گروہ بھی شامل تھا جس کا نام (Gaga) ہے، یہ نام توراتی جوج کے نام سے ملتا جلتا ہے، جوج کا نام قرآن میں یاجوج اور آشوری کتبوں میں اجی جی ملتا ہے، اس جنگ میں غلبہ اس گروہ کو ہوا جس کو جرج کی تائید حاصل تھی اور مردوک نے پھاڑ تیامت کے دو حصے کر دیئے، ان میں ایک حصہ آسمان (سام) اور دوسرا زمین (حام) کے نام سے موسوم ہوا۔

اثری تاریخ

یہ تاریخ اس زمانہ کی ہے جب فن تحریر ایجاد نہیں ہوا تھا، اس کی ایجاد کے بعد ہم کو اس دیار میں دو قومیں ملتی ہیں، جن میں سے ایک کو آثار قدیمہ کے علماء نے سمیری قوم کا نام دیا ہے کیوں کہ قدیم شاہان عراق جو شمالی اور جنوبی دونوں حصوں پر حکومت کرتے تھے، اپنے آپ کو ’’اکاد اور سومیر کا بادشاہ کہتے تھے اور دوسرے گروہ کو بنو سام نام دیا گیا ہے جن کی بولی عربی اور عبرانی وغیرہ زبانوں کے مطابق تھی۔

افسانوی تاریخ میں سمیری قوم کا ذکر جاجا کے نام سے آیا ہے، جو توراۃ کا جوج اور قرآن کا یاجوج ہے، اس زمانہ میں یہ قوم لخم اور کنجو کے مقابل غیر اہم تھی لیکن اثری زمانہ میں جو فن تحریر کی ایجاد کے بعد گذرا ہے ابتداء میں یہی قوم سب سے اہم تھی اور سب سے پہلے اسی قوم سے اس دیار کے متعدد شہروں میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم کیں، پھر کچھ عرصہ بعد سامی زبانیں بولنے والوں نے بھی حکومت اور اقتدار میں حصہ بٹانا شروع کیا، اسی زمانہ کی بابت توراۃ میں ہے کہ: ’’عابر سے دو فرزند پیدا ہوئے ان دو میں سے ایک کا نام فلج رکھا، کیوں کہ اس کے زمانہ میں زمین بانٹی گئی اور دوسرے کا نام یقطن رکھا گیا۔‘‘

سب سے قدیم سامی بادشاہ جس نے ارض عراق میں اپنی حکومت قائم کی تھی حال کی تحقیقات کے مطابق کش کا شہر یاد مسیلم تھا، اس کا زمانہ اندازاً ۴۲۰۰ ق م قرار دیا جاتا ہے، اس کے جانشینوں کی حکومت عروج وزوال کے ساتھ ۳۸۰۰ ق م تک قائم رہی، پھر پورے علاقہ مابین دجلہ وفرات پر ایک دوسرے سامی خانوادہ نے قبضہ کر لیا، جس کا مرکز حکومت اکاد تھا اور اس خانوادہ کے بانی کا نام تھا۔ ’’شارجنی سارعلی بن اقی بل‘‘ اس کو آشوری روایتوں کے مطابق سرجون اکبر بھی کہا جاتا ہے، یہ نام توراتی عابر کے پوتے

سروج بن رعو کے نام سے ملتا جلتا ہے۔

سرجون اکبر کے برسرعروج آنے سے پہلے ایک شہر سر برلامن پر جس کو جرسو، بن جرسو اور سنجر بھی کہتے ہیں، ایک سمیری خانوادہ حکومت کرتا تھا، جس کے قدیم ترین فرماں روا کا نام ادرکا جنا ہے اس کی حکومت مسیلم سے تقریباً سو برس پہلے قائم ہوئی اور سرجون اکبر کے زمانہ تک عروج وزوال کے ساتھ قائم تھی، سرجون اکبر کے پہلے اُدرادرگوتی نام دوشہروں میں دو اور حکومتیں سونیر یون کی تھیں، خاندانِ سرجون کی حکومت ضعیف ہوجانے اور ابرخ، ای س اور لارسا میں چھوٹی چھوٹی حکومتیں قائم ہوئیں، ۲۴۰۰ھ ق م کے قریب ان تمام حکومتوں کو ایک نئے خاندان نے جس کے بانی کا نام ساموابی تھا اور جس کا پایۂ تخت شہر بابل تھا، ختم کردیا، ساموابی کے خانوادہ کو عربی خاندان بتایا جاتا ہے۔

اس طرح بابل میں یکے بعد دیگرے سات خانوادوں نے ۷۲۸ ق م تک حکومت کی، جن میں سے دوسرے خانوادہ کے گیارہ بادشاہوں کے نام سومیریون کے سے ہیں، اس خانوادہ کے خاتمہ (۱۴۸۰ ق م) کے بعد سے سمیری قوم بتدریج اس طرح نابود ہوجاتی ہے کہ پھر اس کا سراغ نہیں ملتا۔

۱۸۳۰ ق م کے قریب ملک اشور میں ایک اور سامی قوم نے اپنی عظمت ووقار کی بنیاد رکھی۔ قرآن کریم میں قوم یونس کے نام سے اسی قوم کا ذکر آیا ہے جس کے ایک بادشاہ ثغلات بلاسر (توکلتی اپال اشور) نے ۷۲۸ء میں بابل کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس علاوہ پرخود اپنا راج قائم کرلیا، لیکن ۶۰۶ ق م کے بابل کے ایک اشوری گوورنر بنواپل اشور نے بابل میں ایک نئے خانوادہ کی بنیاد ڈالی، جس کو ۵۲۸ ق م میں ایرانیوں نے شکست دے کر اپنے ماتحت کرلیا۔

یہ ہے بابل کے اس عہد تک کی مختصر تاریخ جس عہد کے بابل کا قرآن کریم میں ذکر آیا ہے، بنواپل اشور (بنوپلاسر) کے فرزند بنوکدرادسر کا بائبل میں بنوکدرصر کے نام سے ذکر آیا ہے۔ یہ نام بنوخدنصر، پھر بنوخت نصر، پھر بخت نصر ہوکر عربی تاریخوں میں بخت نصر بن گیا ہے، اسی بخت نصر کے زمانہ کی تاریخ بنی اسرائیل کی طرف سے خدا نے سورۂ بنی اسرائیل کی پانچویں آیت میں اشارہ فرمایا ہے۔ بنواسرائیل پر بخت نصر نے چڑھائی کی اور بہتوں کو گرفتار کرلیا اور لے جاکر بابل کی سرزمین میں ان کو بسایا۔ ایرانیوں کے زمانہ میں اُن کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی، اسی اسیری بابل کے زمانہ میں بنواسرائیل نے وہ چیز سیکھی جس کی بابت قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ.

❁ .... ❁ .... ❁

سنتِ نبویؐ کی اتباع

اور

اس کی فضیلت

مولانا احتشام الحسن صاحب

اللہ رب العزت نے مجسمۂ انسانی کو اپنے ہاتھ سے تخلیق کیا، اس کو اشرف المخلوقات کا لقب دیا، اس کی فطرت میں حق و باطل، ہدایت وضلالت اور خیر وشر کے دو متضاد مادے رکھ دیئے اور اس کو دار الامتحان میں پہنچادیا۔ انسان اگر راہِ حق کا مسافر بن جائے تو فرشتے اس کی قدم بوسی کو اتریں اور اگر فطرت سے بغاوت پر آمادہ ہو جائے تو جانور بھی اس سے پناہ مانگیں۔ انسان کو رضائے الٰہی کی منزل تک پہنچنے کے لیے کسی نمونہ، آئیڈیل اور میر کارواں کی ضرورت پڑھتی ہے، جس کے نقشِ قدم پر چل کر اور نشانۂ منزل کو اپنا کر دائمی کامیابی کو پاسکے۔

اللہ رب العزت نے امتِ محمدیہ پر ایک عظیم احسان کیا، خاتم النبیین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی شکل میں ایک نجات دہندہ عطا کیا، ایک بے مثال، بے نظیر، آئیڈیل ونمونہ ودیعت کیا، ہدایت و خیر کے اس روشن چراغ کو جبلِ فاران کے افق سے نمودار کیا، جو بلند ہوا اور ہوتا جارہا ہے، جو چمکا اور چمکتا جارہا ہے، جو بڑھا اور بڑھتا جارہا ہے، جو پھیلا اور پھیلتا چلا جارہا ہے، جس کی کتابِ حیات کا ہر ورق وصفحہ، ہر موضوع وعنوان، ہر سطر وجملہ اور ہر حرف ولفظ، ہر زمانہ، ہر شعبہ میں ہدایت کا روشن چراغ ہے، جس نے زمانہ ومکان کی لامحدود وسعتوں کو مہر درخشاں کی مثل ضوفشاں کر دیا، انسانی معاشرے کے دشت بے اماں میں گل ہائے رنگا رنگ اور میوہ ہائے شیریں سے لدے شجر سایہ دار کھڑے کر دیئے اور افق تا افق محیط

تاریکیوں کے سینے پر روشنی کی کرنیں پھیلا دیں۔عرب کے صحرانشینوں نے آپ کی پیروی اور اتباع کر کے روم وفارس اور عرب وعجم پر حکمرانی کی ہے ؎

جس راہ سے گزریں گے محمد ﷺ کے فدائی
اس راہ کے ہرذرے کو بیدار کریں گے

اتباع کیا ہے؟

اتباع کا معنی ہے ’’پیروی کرنا،تابعداری کرنا اور پیچھے چلنا‘‘۔

امام فراءفرماتے ہیں:

’’الاتباع أن یسیر الرجل وأنت تسیر وراء ہ‘‘ (نضرۃ النعیم:۱۰/۲)

اتباع کا اصل معنی ہے **’’اقتفاء أثر الماشی‘‘** کسی کے نقشِ قدم پر چلنا،حکیم اختر صاحبؒ فرماتے ہیں:

نقشِ قدم نبی کے ہیں جنت کے راستے
اللہ سے ملاتے ہیں سنت کے راستے

اتباع **’’تبعیۃ‘‘** سے ہے، **’’تبعیۃ‘‘** اس بچہ کو کہا جاتا ہے جو اپنی ماں اور باپ کی بلاسوچے سمجھے نقل کرتا ہو۔حضور اکرم ﷺ کے لیے قرآن مجید اتباع کا لفظ اس لیے لایا تا کہ ہم آپ ﷺ کی بغیر سوچے سمجھے اور بلا چوں چرا پیروی کریں۔امام احمدؒ،امام شافعیؒ اور امام ابن عبد البرؒ اتباع کی اصطلاحی تعریف یوں کرتے ہیں: **’’ھو أن یتبع الرجل ما جاء عن النبی ﷺ وعن أصحابہ ثم ھو من بعدفی التابعین مخیر‘‘** (نضرۃ النعیم:۱۰/۲، بحوالہ أضواء البیان للسلقیطی:۵۳۸/۷)

ترجمہ: اتباع یہ ہے کہ کوئی شخص حضور ﷺ ،صحابۂ کرام کی اتباع کرے اوان دونوں طبقات کے بعدوالوں یعنی تابعین کے بارے میں اختیار ہے،چاہے ان کی اتباع کرے،یا نہ کرے۔

سنت کسے کہتے ہیں؟

سنت ایک خاص طریقہ اور ضابطہ کو کہا جاتا ہے۔اس کا اطلاق سیرت وعادت اور فطرت ومزاج پر بھی ہوتا ہے۔ہر صاحب لغت نے اپنے مزاج اور طبیعت کے مطابق سنت کی لغوی تحقیق کی ہے،علامہ ابن دریدؒ نے " کتاب الجمہرۃ" میں صفحہ ۹۵ پر، اسمٰعیل بن حماد جوہریؒ نے الصحاح صفحہ ۵۱۸ پر،،علامہ محمد مرتضیٰ

زبیدیؒ نے ''تاج العروس'' کے ۹/۳۴۳ پر، امام راغب اصفہانیؒ نے ''المفردات'' کے صفحہ ۲۵۰ پر، علامہ زمخشری نے ''اساس البلاغۃ'' کے صفحہ ۳۶۹ پر اور علامہ ابن اثیرؒ (الجزری) نے ''النہایۃ'' ۱/۳۱۸ پر سنت کی لغوی تحقیق کی ہے۔ علامہ ابن منظور افریقیؒ (مصری) نے ''لسان العرب'' میں جو تحقیق کی ہے وہ سب کا لبِ لباب ہے وہ فرماتے ہیں:

''والسنة : الطريقة والسيرة حسنة كانت أوقبيحة ،قال خالد بن عتبة الهذيلي:''فلا تجزعن سيرة أنت سرتها ، فاول راض سيرة من يسيرها والحديث: من سن سنة حسنة فله أجرها و أجرمن عمل بها ومن سن سنة سيئة كان عليه وزرها وزر من عمل بها. (لسان العرب:۳۹۹/۶۲)

ترجمہ: سنت سیرت کے معنی میں بھی آتا ہے خواہ اچھی ہو یا بری چنانچہ ہذیلی شاعر کہتا ہے: جو سیرت تم نے اختیار کر لی ہے، اس سے ہرگز مت گھبراؤ اس لیے کہ جو شخص کوئی سیرت اختیار کرتا ہے وہی اس کا سب سے پہلا پسند کرنے والا ہوتا ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ: جس شخص نے اچھی سنت اختیار کی اس کو اس کا اجر اور جس نے بری سنت اختیار کی اس کا گناہ اس کو ملے گا۔

سنت کی اصطلاحی تعریف فنون واغراض کے مختلف ہونے سے بدل جاتی ہے، محدثین، فقہاء اور اصولیین نے اپنی اپنی سوچ اور زاویہ سے سنت کی تعریف کی ہے، چند صفحات سب کے تحمل سے قاصر ہیں، اس لیے خلاصۃً ایک ہی ذکر کی جاتی ہے: **''كل ماأثر من النبى صلى الله عليه وسلم من قول، أوفعل، أوتقرير، أوصفةخلقية أو خلقية سواء كان ذالك قبل البعثة كتحنثه فى غار حراء أوبعدها.''** (السنۃ قبل التدوین: ۱۸-۱۹)

ترجمہ: سنت ہر وہ قول، فعل اور تقریر جو نبی کریم ﷺ سے منقول ہو، چاہے وہ فطری ہو یا اخلاقی، قبل البعثت ہو یا بعد البعثت۔

سنت کی دو اقسام ہیں: ۱) سنتِ مؤکدہ اور ۲) سنتِ غیر مؤکدہ۔ پہلی ہدی اور دوسری کو زوائد کہتے ہیں۔ علامہ مکحولؒ فرماتے ہیں: **''السنة سنتان :سنة الأخذبهافريضة ،وتركهاكفر ،وسنة الأخذبهافضيلة،وتركهاالي غيرحرج''**

ترجمہ: سنت کی دو قسمیں ہیں: (۱) جس پر عمل کرنا فرض کا درجہ رکھتا ہے اور ترک کفر تک پہنچاتا ہے۔ (۲) جس پر عمل کرنے سے ثواب ملتا ہے اور چھوڑنے میں کوئی حرج نہیں۔

اتباع سنت فطری تقاضا

شریعت کے قوانین وضوابط اپنی جگہ،مگر فطرت کے بھی کچھ تقاضے ہوتے ہیں،محبت کے بھی کچھ اصول ہوتے ہیں۔انسانی فطرت ہے کہ جو جتنا بڑا محسن ہوتا ہے طبیعت اس جانب مائل ہوتی اوراس کے رنگ میں رنگنے کا جی چاہتا ہے۔محبّ ہمہ تن اسی جستجو میں رہتا ہے کہ محبوب کی محبت میں اضافہ ہی ہوتا چلا جائے ۔امت محمدیہ میں کوئی فرداس وقت تک مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک حضور ﷺ کی محبت سب محبتوں پر غالب نہ ہو،اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "النبی أولی بالمؤمنین من أنفسهم"(سورۂ احزاب:۶)

مسلمانوں نے آپ ﷺ کی محبت میں ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے ہیں کہ دنیا ان جیسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔مسلمانوں نے اپنا تن، من، دھن آپ ﷺ کی ناموس عصمت پر نچھاور کردیں۔

محبّ تو محبّ رہا،محبوب کے کیا کہنے......!!ہروقت اور ہر گھڑی اپنی امت ہی کی فکر میں ہیں عرش ہو یا فرش، دن ہو یا رات، گرمی ہو یا سردی، صحت ہو یا مرض، خوشی ہو یا غمی، مرض الموت ہو یا قیامت، حشر ہو یا نشر، ہروقت ایک ہی صدا، ایک ہی ندا، ایک ہی پکاراور ایک ہی التجا ہے، یارب امتی امتی! آپ ﷺ سے ہم اتنی محبت کرتے ہوں اور حضور ﷺ کے ہم پر اتنے احسانات ہوں، اس کے باوجود بھی ہم سنتوں کو سنت کہ کر چھوڑ دیں تو کہاں کا انصاف ہے؟ یقیناً ہم کچھ بھول رہے ہیں......!!

اتباعِ سنت قرآن مجید کی نظر میں

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں مختلف مواقع پر مختلف انداز میں سنتِ نبوی کی اتباع کا حکم دیا ہے،کبھی وعدہ کرکے تو کبھی وعید سنا کر،کبھی ڈانٹ کر،کبھی خوش خبری سنا کر تو کبھی ڈرا کر،کبھی انعام دے کر تو کبھی عذاب سنا کر۔سب کا لب لباب اور خلاصہ یہی ہے کہ تمہیں پسند ہو یا ناپسند،تم پر خوش گوار گزرے یا ناگوار،تمہیں ہر حال میں محبوب ﷺ کی اتباع کرنی ہے۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی ذات کو بہترین آئیڈیل قرار دیا۔

(۱)لقد كان لكم فی رسول الله أسوة حسنة. (احزاب:۲۱)

کہیں پر مطلق اطاعت کا تاج آپ ﷺ کے سر پر رکھ دیا:

(۲)وماأرسلنا من رسول الا ليطاع باذنِ الله. (نساء:۶۴)

کہیں پر رسول کی اطاعت کو اپنی اطاعت قرار دیا:

(۳)من یطع الرسول فقد اطاع الله. (نساء:۸)

کہیں پر اپنی محبت کے حضور ﷺ کی اتباع کے ساتھ مشروط کر دیا:

(۴)قل ان کنتم تحبون الله فا تبعونی یحببکم الله. (آل عمران:۳۱)

کہیں پر رسول ﷺ کے امر ونہی کا پابند بنا دیا:

(۵)ما آتکم الرسول فخذوہ ومانھاکم عنه فانتھوا. (حشر:۷)

اللہ رب العزت نے جس طرح اپنے کلام میں اتباعِ سنت کی تاکید وتلقین کی ہے، اسی طرح تکوینی طور پر حضور پاک ﷺ کی ایک ایک سنت کو زندہ رکھا۔ آج دنیا بھر میں فقہاء کے چار مسالک رائج ہیں۔ بظاہر تو وہ فقہی اختلافات نظر آتے ہیں، مگر درحقیقت ہر ہر سنت کی اتباع کا غیر محسوس طریقہ ہے۔

اتباعِ سنت نبی پاک ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں:

آقائے نامدار حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ خاتم النبیین وخاتم المرسلین ہیں۔ آپ جانتے تھے کہ ایک نبی ورسول کا مقام ومرتبہ کیا ہوتا ہے، اس کے حکم وامر کی کیا حیثیت ہوتی ہے، اور اگر کوئی حکم عدولی کرے تو اس کا انجام قوم عاد، لوط اور قوم نوح کی طرح ہوتا ہے اور اس کا حشر فرعون، ہامان اور نمرذ کی طرح ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے آپ ﷺ نے بروقت اپنی امت کو اطاعت واتباع کی ترغیب وتربیت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

(۱)فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء المجتھدین الراشدین تمسکوا بھا و عضوا علیھا بالنواجذ. (رواہ احمد:۲۸/ ۳۷۳)

ترجمہ: تم پر میری اور میرے خلفائے راشدین کی سنت پر عمل لازمی ہے اس کو تھام لو اور اس پر مضبوطی اختیار کرو۔

(۲)من تمسك بالسنة دخل الجنة. (کنز العمال:۱/ ۱۰۵)

ترجمہ: جس نے سنت کو تھاما، وہ جنت میں داخل ہو گیا۔

(۳)فمن کانت فترته اِلیٰ سنتی، فقد افلح، ومن کانت فترته الیٰ غیر ذلك، فقد ھلك. (رواہ احمد:۱۱/ ۳۷۵)

ترجمہ: جس کا اطمینان جا کر میری سنت پر ہوا، وہ کامیاب ہو گیا اور جس کا اطمینان اس کے علاوہ پر ہوا، وہ ہلاک ہو گیا۔

(۴)فمن رغب عن سنتي فليس مني.

(رواہ البخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح:۵۰۶۳، والمسلم، کتاب النکاح:۱۴۰۱، وأحمد:۱۱/ ۹)

ترجمہ: جس نے میری سنت سے بے رغبت کی وہ مجھ سے نہیں ہے۔

(۵)من أحب سنتي فقد أحبني ومن أحبني كان معي في الجنة.

(تہذیب تاریخ دمشق الکبیر:۳/ ۱۴۵)

ترجمہ: جس نے میری سنت سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے مجھ سے محبت کی وہ میرے ساتھ جنت میں ہوگا۔

(٦)من تمسك بسنتي عند فساد أمتي فله أجر مائة شهيد.

(مشکوۃ المصابیح:۱/ ٦۲، رقم:٦۱۷۶، ط:المکتب الاسلامی)

جس نے میری امت کے فساد کے وقت میری سنت کو تھاما، اس کو سو(۱۰۰) شہیدوں کا ثواب ملے گا۔

(۷)خير الحديث كتاب الله، خير الهدى هدى محمد صلى الله عليه وسلم ومن شر الأمور محدثاتها، وكل بدعة ضلالة. (المسلم:۲/ ۵۹۲)

ترجمہ: بہترین کلام کتاب اللہ ہے، عمدہ سیرت، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے، اور اس میں نئی چیزیں گھڑنا بدترین کام ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

قرآن وسنت کی ان قطعی نصوص کے بعد کیا کوئی حجت باقی رہ جاتی ہے۔ حیرت اور تعجب ہوتا ہے کہ آخر ہم کہاں پھرے جا رہے ہیں! ہم پیچھے مڑ کر کیوں نہیں دیکھتے!

❁ .... ❁ .... ❁

نکاح کو عذاب نہ بنائیے

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث ونائب ناظم تعلیمات جامعہ ہٰذا

نکاح کا عمل شریعت میں اتنا سادہ ہے کہ کسی اور دھرم میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مناسب رشتہ ملنے پر بالغ لڑکا اور لڑکی دو گواہوں کی موجودگی میں ایجاب وقبول کر لیں، بس نکاح ہو گیا۔ مہر لازم ضرور ہے، مگر نکاح میں اس کا ذکر قطعی ضروری نہیں۔ اتنا سادہ عمل، مگر اب اتنا مشکل ہو چکا کہ اب اس پر عذاب کا گماں گزرتا ہے۔ لڑکی کے غریب اولیا آٹھوں پہر روتے ہیں۔ صبح سے شام غم واندوہ میں گزار دیتے ہیں۔ ان کا سکون غارت ہے۔ ذہنی آسودگی کا دور دور تک واہمہ نہیں۔ زندگی اجیرن ہے۔ رشتہ مل نہیں رہا۔

نکاح کا عمل اتنا دشوار تو نہیں

آج کل کسی کی شادی ہو تو اصل کام میں صرف دو منٹ صرف ہوتے ہیں اور بس۔ مگر لوازمات اس قدر شامل ہو جاتے ہیں کہ بیان سے باہر۔ اس دو منٹ کے عمل کے لیے غریب والدین اپنی عمرِ عزیز کے خوش گوار لمحے کھو بیٹھتے ہیں۔ اولاً تو غربت ہی انہیں بڑھنے نہیں دیتی، پھر قسمت یاوری کرے تو ان کے پاس مطالبات کی ایسی طویل فہرست آ جاتی ہے کہ بار بار کی مشقتوں کے باوجود ہنوز روزِ اول۔

لڑکے والوں کے مظالم

نکاح کو عبادت کے زمرے سے نکال کر عذاب کی صف میں لانے ذمے دار زیادہ تر لڑکے والے ہیں۔ رشتہ پیش ہو تو عموماً یہی ہوتا ہے کہ لڑکا داستانِ امیر حمزہ کی طرح مطالبات کی طول طویل فہرست رکھ دیتا ہے۔ اس کی فرمائشیں اس بے شرمی سے سامنے آتی ہیں کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں۔ کبھی لڑکا شریعت نواز ہوتا ہے اور ان خرافات سے بچتا ہے تو اس کے والدین زوردار دباؤ ڈال کر اسے قائل کر چھوڑتے ہیں، والدین کی

بدتمیزیوں سے مجبور لڑکا ان کے مطالبات کے سامنے ڈھیر ہو جاتا ہے۔کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ لڑکا بھی اسلام پسند ہوتا ہے، اس کے والدین بھی مذہب پسند ہوتے ہیں، مگر ظالم معاشرہ اس کارِخیر میں سدِ سکندری بن جاتا ہے۔وہی لین دین کرواتا ہے اور لعنتوں کو دعوت دیتا ہے۔غرض قصورواروں کی کمی کوئی نہیں۔

شادی کے موجودہ ارکان

جس طرح وضو میں چار چیزیں فرض ہیں، اسی طرح ہمارے معاشرے نے بھی شادی کے ارکان گھڑ لئے ہیں۔شادی کا پہلا رکن سلامی ہے، دوسرا رکن گاڑی، جب کہ تیسرا رکن قارونی جہیز ہے اور چوتھا رکن بارات۔جب تک یہ چاروں ارکان پائے نہ جائیں، شادی ہی ادا نہ ہوئی۔

ارکانِ اربعہ کی تشریح

سلامی کا مطلب ہے شادی کی فیس۔آپ اسے لڑکے کی قیمت بھی کہہ سکتے ہیں۔کوئی رشتہ لڑکے کے پاس پہونچے تو سلامی سے ہی بات شروع ہوگی۔یہ رقم درجات کے اعتبار سے بڑھے گی اور گھٹے گی۔لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے تو اس کی سلامی سات، آٹھ لاکھ روپے سے کم نہ ہوگی۔متوسط ہے تو اس کی قیمت چار، پانچ لاکھ روپے ہیں، اور اگر جاہلِ مطلق ہے تو ڈیڑھ دو لاکھ روپے تو کہیں نہیں گئے۔لڑکی والے مال دار ہوں تو لڑکے کا ریٹ وہ خود ہی اونچا لگاتے ہیں، اتنا اونچا کہ لڑکے والوں کے پاس قبولیت کے سوا کوئی راستہ نہ بچے۔دس، بارہ لاکھ روپے تک سلامی کے عنوان سے لٹا ڈالتے ہیں۔گاڑی شادی کی رکنِ ثانی ہے، لڑکا اپنی قابلیت کے لحاظ سے گاڑی کی مانگ رکھتا ہے۔اعلیٰ اور متوسط لڑکے چار پہیے کی مانگ رکھتے ہیں اور ادنیٰ لڑکے موٹر سائیکل کی۔رہی سائیکل، تو وہ بے چاری تو کبھی کی مرحومہ بن چکی۔رکنِ ثالث قارونی جہیز ہے۔جہیز میں گھر کے تمام ضروری اشیا شامل ہیں۔چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی۔لکڑی کے سارے سامان تخت، الماری وغیرہ تو پہلے ہی سے جہیز کے ارکانِ اعظم تھے، اب ٹی وی، فریج، واشنگ مشین، مکسر اور بجلی سے چلنے والے تمام لوازمات بھی ان میں داخل ہو چکے ہیں۔یہ سارا مال لڑکے اور اس کے گھر والوں کی ملکیت بن جاتا ہے۔لڑکی کا کوئی اختیار اس پر باقی نہیں رہتا۔جہیز کے یہ مطالبات بالعموم لڑکے والوں کی طرف سے ہوتے ہیں، مگر کبھی لڑکی والے بھی اپنی دولت کی نمائش اور شوکت کے اظہار کے لیے خود ہی بھیج دیتے ہیں۔شادی کا رکنِ رابع بارات ہے۔شادی کے دن لڑکے کے گھر سے اس کے اہلِ خانہ، دوست احباب اور پڑوسی واہلِ بستی کے افراد پر

مشتمل ایک بھاری جمعیت دولہا کے ساتھ روانہ ہوتی ہے۔ یہ کہنے کو مہمان ہوتے ہیں، مگر کسی تخریب کار تنظیم کے اراکین کی طرح نظر آتے ہیں۔ پورے طمطراق اور زور وشور کے ساتھ نکلیں گے۔ دہشت گردی کی تصویر بنے ہوئے۔ بارات میں سو افراد کی دعوت ہو تو ساڑھے تین سو افراد ٹپک پڑیں گے۔ شادی کے یہ ارکان اتنے خطرناک ہیں کہ لڑکی والوں کا تو دیوالیہ ہی نکل جاتا ہے۔ شادی سے پہلے رشتے کی تلاش میں شکستہ اور خستہ والدین شادی کے بعد انتہائی مفلوک الحال ہوجاتے ہیں۔ سچ کہیے تو یہ والدین مستحقِ زکوۃ بھی بن جاتے ہیں۔

شادی کے بعد کی رسومات

ارکانِ اربعہ کی ادائیگی کے بعد شادی تو خیر ہوگئی، مگر ابھی کچھ واجبات باقی ہیں۔ واجباتِ شادی بھی چار ہیں۔ نمبر ایک : اسراف، یعنی فضول خرچی، نمبر دو : نو روز، نمبر تین : نمک چکھائی، نمبر چار : چھوٹی سلامی۔ واجب نمبر ایک تو عام ہے، لڑکے والے خود بھی فضول خرچی کرتے ہیں اور لڑکی والوں پر بھی دباؤ بناتے ہیں۔ لڑکے والے کا شادی نامہ دیکھیے تو فضول خرچی کا شاہ کار نظر آئے گا۔ رنگین، دبیز اور خوش رنگ کاغذ، مہنگی اور حسین چھپائی۔ بارات میں گاڑیوں کی بہتات۔ دولہے کی گاڑی آرائش وزیبائش میں مثالی۔ بارات کی روانگی، درمیانِ سفر اور پھر بارات گاہ پہونچ کر گرج دار پٹاخے۔ پٹاخوں کی آوازیں ایسی خوفناک کہ محسوس ہو کارگل محاذ پر بیٹھے ہیں۔ تاہم اسراف کا تعلق لڑکے والوں سے کم اور لڑکی والوں سے زیادہ ہے۔ شاہ خرچیوں کا سارا بار غریب لڑکی والوں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ انہیں تو لڑکی کا گھر بسانا ہے، اس لیے وہ ہر کڑوی گولی اور ہر زہر پینے کو تیار رہتے ہیں۔

شادی کے بعد لڑکی اپنی سسرال چلی جاتی ہے اور چوتھے دن میکے آتی ہے۔ لڑکی کے ساتھ اس کا دولہا بھی ہوتا ہے۔ لڑکی میکے میں اپنے شوہر کے ساتھ زیادہ سے زیادہ نو روز قیام کرسکتی ہے۔ اسی مناسبت سے اس رسم کا نام ''نو روز'' ہے۔ نو روز کی یہ رسم اب سکڑ کر چار پانچ دنوں تک محدود رہ گئی ہے، مگر اس کا نام اب بھی نو روز ہی ہے۔ اس دوران لڑکی والوں پر شاہ خرچی کا جو بوجھ پڑتا ہے، خدا کی پناہ ! یہ ایک الگ عذاب ہے۔ غریب والدین تو اس رسم میں تو گویا مرہی جاتے ہیں۔ تینوں وقت زوردار ضیافت۔ گوشت، مچھلی اور مختلف مرغن پکوان۔ صبح شام ایک لنگر چل رہا ہے۔ خشک میوہ جات کا اہتمام الگ۔

واجبِ سوم 'نمک چکھائی' ہے۔ نو روز میں لڑکا آئے گا تو نمکین اشیا پہلے دن اس وقت تک نہیں کھائے گا جب تک اس کا مطالبہ خاطر خواہ پورا نہ ہو۔ نمکین اشیا میں گوشت مچھلی اور ہر وہ چیز شامل ہے، جس میں

نمک پڑتا ہے۔لڑکے کی مانگ اس وقت اولاً چار پہیے کی ہوگی۔اب یہ لڑکی والوں پر منحصر ہے کہ لڑکے کو اتار کر کہاں تک لے آتے ہیں۔کم از کم بیس ہزار روپے تو لازمی ہی ہیں۔لڑکی والے ان کی منہ مانگی مراد پوری کریں گے تو داماد صاحب کھانا کھائیں گے، ورنہ انہیں مناتے رہیے، وہ مانیں گے نہیں۔

'چھوٹی سلامی' کا مطلب یہ ہے کہ نوروز کے بعد لڑکا اپنی اہلیہ کو لے کر گھر جانے لگے تو اسے پھر فیس پیش کرنی ہے۔یہی فیس چھوٹی سلامی ہے۔اب یہ لڑکی والوں کا ظرف ہے کہ کیا دیتے ہیں۔ان واجباتِ اربعہ کے بغیر شادی رنگ نہیں پکڑتی۔

شادی پر ہندوانہ رنگ کا غلبہ

شادی کی رسومات، فرائض اور واجبات کو دیکھیے تو کہیں سے کہیں تک محسوس نہیں ہوگا کہ کسی مسلم برادری میں شادی چل رہی ہے۔گانے بجانے سے لے کر شور شرابے تک۔رسومات وخرافات میں لڑکے والے تو ظالم اور مفسد ہیں ہی، لڑکی والے بھی کم مجرم نہیں ہیں۔دونوں جگہ ہندوانہ تہذیب کا غلبہ۔گیت، اپٹن، مانجھا، چومائی، دریا کھدائی اور نہ جانے کیا کیا!! ہر ایک پر ہندوانہ چھاپ۔شادی بیاہ جو ایک خالص ایمان کی تکمیل کا سبب تھی، ایمان کی تباہی کی ضامن بن گئی۔

لڑکے والوں کے ناجائز نخرے

لڑکے والوں کے کچھ مظالم کا اوپر ذکر ہوا۔یہاں چند اور پیش خدمت ہیں۔شادی سے پہلے ان کا ایک بڑا مطالبہ یہ ہے کہ لڑکی بے حد حسین وجمیل ہو۔ماڈرن طرزِ زندگی رکھتی ہو۔وہ پڑھی لکھی بھی خوب ہو، کم از کم بارہویں پاس تو ہو ہی، اس تعلیم کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ گھر کی فضا خوش گوار بنے اور آنے والی نسلیں تہذیب وشرافت کی نقیب ہوں، بلکہ اس کا واضح ترین مقصد معاش کی مضبوطی ہے، تاکہ گھر کا بوجھ صرف شوہر پر نہ پڑے، عورت بھی اس میں حصہ دار بنے۔لڑکی تعلیم یافتہ ہوگی تو آفس سنبھال سکتی ہے۔ملازمت کر سکتی ہے۔گھر گھر جا کر ٹیوشن پڑھا سکتی ہے۔غیر تعلیم یافتہ عورت ظاہر ہے کہ وہ یہ خدمات انجام نہیں دے سکتی۔اس میں دنیا داروں کی قید نہیں، دین داروں میں بھی یہ رجحان اپنی جڑ پکڑ چکا ہے۔

رسمِ منگنی

لڑکے یا لڑکی کی طرف سے ایک دوسرے کے پاس پیغامِ نکاح بھیجا جاتا ہے، یہ ایک پرانا طریقہ ہے اور

قرآن وحدیث سے ثابت۔ اسی کا نام عربی میں 'خطبۃ' ہے اور اردو میں یہی عمل 'منگنی' کہلاتا ہے۔ آپ اسے 'شادی کی تمہید' بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک مبارک اور مسنون عمل ہے۔ احادیث کا ذخیرہ اس کے ذکر سے بھرا پڑا ہے، مگر معاشرے کی ستم ظریفی تو دیکھئے، یہ مسنون عمل بھی رسومات کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اس رسم میں جو جو خرافات ہوتی ہیں ان کے تصور سے ہی کلیجہ کانپ جاتا ہے۔ دونوں طرف سے مہمانوں کی بھیڑ ایک دوسرے کے گھر اکٹھی ہوتی ہے۔ جم کر اخراجات ہوتے ہیں۔ دعوتیں اڑائی جاتی ہیں۔ ہر مرحلے کی طرح یہاں بھی لڑکی والوں پر مظالم کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ شادی کی تمہید میں شادی کا کم از کم چوتھائی حصہ تو صرف ہو ہی جاتا ہے۔ اس رسم کی خاص بات یہ ہے کہ لڑکے والے لڑکی کو چلا کر دیکھتے ہیں۔ کہیں لنگڑی اور عیب دار تو نہیں؟ بعض علاقوں میں رانوں تک ننگا کیا جاتا ہے، کہیں کوئی داغ تو نہیں؟ بالوں کی لمبائی پر نظر رکھنے کے لیے سر بھی برہنہ کیا جاتا ہے۔ لڑکی سے غیر محرم لوگ انٹرویو بھی لیتے ہیں، کہیں یہ گونگی تو نہیں؟ پڑھوا کر اور لکھوا کر دیکھتے ہیں، کہیں جاہل تو نہیں؟ ایک رسم اور دیکھنے میں آئی ہے۔ حال ہی میں ارریہ کے ایک اردو صحافی کے گھر منگنی کی خبر اخبارات میں چھپی تھی۔ فوٹو بھی شائع ہوا تھا۔ لڑکی کو بیس، پچیس افراد کے درمیان بٹھا کر کھلا چہرہ رکھا گیا تھا۔ لوگ اسے بے محابا دیکھ رہے تھے۔ بعضے گھور رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عمل قطعی مذہبی نہیں ہوسکتا، مگر یہ ساری خرابیاں چل رہی ہیں۔ پنپ رہی ہیں۔ راج کر رہی ہیں، لیکن افسوس کہ کوئی کچھ بھی کہنے کو تیار نہیں۔

منگنی سے پہلے اور منگنی کے بعد لڑکے اور لڑکی کے باہمی تعلقات

نکاح کے باب میں اب ایک رسمِ بد اور چل پڑی ہے۔ دونوں جانب سے رشتے کی منظوری کے بعد مرد اپنی منگیتر سے باتیں کرتا ہے، ہر دن اس سے رابطہ کرتا ہے، اس سے گھنٹوں باتیں ہوتی ہیں، باہمی گفتگو میں صرف آوازوں کا تبادلہ ہی نہیں ہوتا، بلکہ ویڈیو کالنگ کے ذریعے ایک دوسرے کی رونمائی بھی ہوتی ہے۔ گفتگو کا انداز وہی بے تکلفانہ، جو میاں بیوی میں ہوتا ہے، نہ لڑکی کے اہلِ خانہ منع کرتے ہیں، نہ لڑکے کے ذمے دار اور اولیا آڑے آتے ہیں بلکہ اب تو یہ بھی ہو رہا ہے کہ رشتہ طے ہوتے ہی مرد اپنی مخطوبہ (منگیتر) کو ایک عدد موبائل بھی دے دیتا ہے، بوقتِ ضرورت ریچارج بھی کراتا رہتا ہے۔ لڑکی اپنے مخطوب (ہونے والے شوہر) کو شوہر ہی سمجھتی ہے اور مرد اپنی مخطوبہ کو بیوی۔ یہ بدعت غیر مہذب گھرانوں کے علاوہ مہذّب گھرانوں میں بھی چل پڑی ہے۔ نہ لڑکے کے والوں کو شرم، نہ لڑکی والوں کو حیا، حالانکہ یہ جاہلی عمل اور کھلا ہوا حرام ہے۔ جب تک نکاح نہیں ہو جاتا، دونوں ایک دوسرے کے لیے غیر محرم ہیں، بات چیت کی کوئی اجازت شریعت نہیں دیتی۔

لڑکی والوں کی ناسمجھیاں

یہاں یہ بھی عرض کر دیا جائے کہ لین دین کے معاملے میں غلطی صرف لڑکے والوں کی نہیں ہوتی، بلکہ بعض اوقات لڑکی والے بھی شریک جرم ہوتے ہیں۔ان کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ رشتے کے لیے ایسے لڑکے تلاش کریں گے جو دنیا پرست ہو، بہت مال دار ہو، بڑے شہر میں مکان یا فلیٹ کا مالک ہو، بڑا تعلیم یافتہ ہو، بڑا خاندانی ہو، جب لڑکی والے ان مطالبات پر اڑے رہیں گے، تو لڑکی کی عمر ضائع تو ہوگی ہی۔شریعت کہتی ہے کہ جب بچے بچیاں بالغ ہو جائیں اور ان کا کفومل جائے تو نکاح میں ذرا بھی تاخیر نہ کی جائے، ورنہ بچوں کے گناہ کا سارا وبال والدین پر ہی پڑے گا۔اس سلسلے میں اصل وہ ہے جو حضور ﷺ نے فرمایا: شادی میں یا تو خاندان دیکھا جاتا ہے، یا مال، یا حسن، یا پھر دین۔تم دین داروں کو ترجیح دیا کرو!

اب دین داروں کو کون پوچھتا ہے،لڑکے ہوں یا لڑکیاں،سب کی نظر مال پر ہوتی ہے۔

لڑکی والوں کی دوسری بڑی غلطی یہ ہے کہ ایسے لڑکوں کو ڈھونڈتے ہیں جو جہیز اور سلامی وغیرہ لے۔ اگر کوئی لڑکا یا اس کے اہلِ خانہ لین دین پر آمادہ نہ ہوں تو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ لڑکا ضرور عیب دار ہوگا۔

لڑکی والوں کی تیسری ناسمجھی یہ ہے کہ بارات کا مطالبہ خود رکھتے ہیں اور نیت یہ ہے کہ گاؤں والے شادی کی دھوم دھام دیکھیں اور خوب واہ واہی کریں۔ والدین کا یہ سارا عمل مجرمانہ اور غیر مومنانہ ہے۔ افسوس کہ یہ بیماریاں بھی عام ہو چکیں۔

سادہ شادی کا ڈھونگ

اب لڑکے والوں کی ایک اور بدمعاشی کا ذکر ضروری ہے۔بعض لڑکے مسنون شادی کا ڈھونگ رچتے ہیں، دو چار افراد کے ساتھ لڑکی والوں کے ساتھ جائیں گے، مسجد میں سادہ طریقے سے نکاح ہوگا اور سادگی کے ساتھ رخصتی بھی کرا لائیں گے، کوئی لین دین نہ ہوگا، لیکن شادی کے چند ہی دنوں کے بعد ان کی ظالم طبیعت جاگ جاتی ہے اور سسرال والوں کے سامنے لمبے مطالبات رکھ دیتی ہے۔ایسے کئی افراد میری نظروں میں ہیں جنھوں نے سادگی کے بعد اس کا زوردار بدلہ لیا اور لڑکی والوں پر جھپٹ پڑے۔گاڑیاں مانگیں، سلامی کی فرمائش کی، فرنیچر کا مطالبہ کیا اور نہ دینے پر دھمکیاں بھی دیں۔جہلا ہی نہیں، علما بھی۔بہار میں آپ سادہ شادی کی تحقیق کر لیں، سب کے پیچھے یہی کہانی ہوگی، الا ماشاءاللہ!

❀ .... ❀ .... ❀

مصنفینِ زنداں

مولانا نسیم اختر شاہ قیصر
استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

جن لوگوں کی زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ عمر کے ہر لمحہ کو کارآمد بنایا جائے، ان کے لئے آزاد فضاء میں سانس لینا یا کال کوٹھری میں عمر کے چند سال یا چند ماہ گزارنا یکساں ہے، ایسے عظیم لوگ ایک مقصد لے کر دنیا میں آتے ہیں اور ہر صورت میں اس کی تکمیل ہی ان کا نصب العین بن جاتا ہے اور یہی چیز ان کی شناخت قرار پاتی ہے۔

دنیا میں رات دن کتابیں لکھی جارہی ہیں، وہ چھپ کر مارکیٹ میں آتی ہیں اور کروڑوں لوگ ان کو پڑھتے ہیں، ان میں لاتعداد کتابیں وہ ہیں جن سے طمانیت قلب اور روح کی غذا فراہم ہوتی ہے، فکر وخیال کو عظمت اور خودی کو ابھارنے والے بہت سے شاہکار وہ ہیں جن کا اعلیٰ علمی وادبی سرمایہ میں شمار کیا گیا ہے، پھر یہ بھی ہے کہ اس طرح کی کتابوں پر کسی ایک فرد یا قوم کی اجارہ داری نہیں ہوتی، بلکہ وہ پوری انسانیت کے لئے سرمۂ نظر بن جاتے ہیں، ایسی کتابوں کے ترجمے ہوتے ہیں اور یہ ترجمے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل جاتے ہیں، ایک اچھا خاصا ذخیرۂ کتب ایسا ہے جو جیل کے اندر وجود میں آیا اور پوری علمی، ادبی دنیا کی نگاہ کا مرکز بنا۔

وہ مصنفین جنہوں نے سلاخوں کے پیچھے علمی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا اور سخت حالات وآزمائشوں کے زمانے میں بھی قلم کی روانی کو متاثر نہیں ہونے دیا ان کی تعداد کافی ہے اور اس مختصر مضمون میں سب کا تذکرہ ممکن نہیں، چند شہرۂ آفاق لوگ ایسے ہیں جو زیرِ قلم ہیں، ان کے احوال اور تصنیفی کارنامے اس مضمون کی بنیاد ہیں، یہ بھی یاد رکھئے کہ مندرجہ بالا عنوان کے تحت لگ بھگ ۳۰ رسال پہلے ایک کتاب منظر عام پر آئی تھی اس مضمون کا محرک اور محور وہی کتاب ہے۔ اردو داں طبقے کے لئے مولانا ابوالکلام آزاد کے خطوط کے مجموعہ ''غبارِ خاطر'' کا نام برسوں پرانا نام ہے، یہ خطوط مولانا آزاد نے اپنی اسارت کے زمانے میں

لکھے تھے، یہ کوئی تصنیف نہیں ہے مگر ان خطوط کی اہمیت، افادیت اور تاریخی معلومات سے انکار نہیں کیا جاسکتا، پھر مولانا مرحوم کے اسلوب اور زبان نے ان خطوط کی چاشنی اس حد تک بڑھادی کہ اس کی مٹھاس ہرار دو قاری کی زبان پر ہے۔ ''غبارِ خاطر'' کو جو شہرت اور مقبولیت ملی وہ کم ہی کتابوں کو حاصل ہوئی ہے، اس لئے مضمون سے پہلے ''غبارِ خاطر'' کا تذکرہ ناگزیر تھا اور موضوع سے مناسبت پیدا کرنے کے لئے چند سطور لکھنی ضروری تھیں۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے نام سے کون واقف نہیں، وہ بلند پایہ محدث اور عالم دین، مجاہد جلیل، انگریزوں کے لئے شمشیر خاراشگاف، تحریک ریشمی رومال کے روح رواں اور جزیرۂ مالٹا کے مشہور قیدیوں میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ دارالعلوم کے پہلے طالب علم تھے، جنہوں نے ایک استاذ ملا محمود کے سامنے اپنی طالب علمانہ زندگی کا آغاز کیا، اس طرح سے شروع ہونے والا یہ مدرسہ ہی دارالعلوم دیوبند کہلاتا ہے اور آج اس کی مقبولیت و مرجعیت، خدمات و کارناموں، اشخاص و افراد کے اعلیٰ کردار و عمل کے چراغوں سے صرف ایشیا نہیں، بلکہ بلادِ عرب اور بلادِ مغرب بھی جگمگار ہے ہیں۔ اس کے فرزندوں نے زمین کے جس حصہ پر قدم رکھا وہاں قرآن وحدیث کی تعلیمات کے سوتے پھوٹے اور اخلاص وللّٰہیت کی نہریں جاری ہوگئیں۔

حضرت شیخ الہندؒ ۱۸۵۱ء یعنی ۱۸۵۷ء سے چند سال پہلے پیدا ہوئے، اس وقت ہر طرف علم و روحانیت کا ماحول تھا، انہوں نے انگریزوں کے ظلم وستم اور ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑے ہوئے دیکھا، تعلیم کے زمانے میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ سے حدیث وفقہ کی کتابیں پڑھیں، فراغت کے بعد معین المدرسین مقرر ہوئے اور کچھ عرصہ کے بعد مسند صدارت پر فائز ہوئے۔ اس زمانے میں درس و تدریس کے علاوہ طلبہ میں انگریزوں کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا کرتے تھے اور انگریزوں سے یہ نفرت آپ کے رگ وپے میں تھی، یہی سبب ہے کہ حالات کا جائزہ لینے اور صورتِ حال کا صحیح تجزیہ کرنے کے بعد آپ نے اپنی مشہور زمانہ تحریک ریشمی رومال کا آغاز کیا۔ یہ ایسی تحریک تھی جس کے بارے میں کئی سال تک انگریز لاعلم رہے اور جب اس کا پردہ فاش ہوا تب بھی یہ سمجھا جاتا رہا کہ اس تحریک کے بانی مولانا عبیداللہ سندھی ہیں۔ یہ ۱۹۱۶ء کا ہنگامہ خیز دور تھا، پورے ملک میں بڑے بڑے سیاسی رہنماؤں کی گرفتاریاں جاری تھیں اور ہر طرف یہی سلسلہ چل رہا تھا، اسی اثنا میں

انگریزوں کو یہ بھنک ملی کہ تحریک کا روح رواں کوئی اور ہے اور ان کو شیخ الہندؒ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل ہوگئیں، آپ اس خیال سے متفکر ہوئے کہ اگر گرفتاری کی نوبت آ گئی تو تحریک سست پڑ جائے گی، اسی لئے ارادہ کیا کہ پہلے حج کے لئے حجاز جائیں اور پھر وہاں سے ایران وافغانستان کے راستے یاغستان پہنچ جائیں، مگر چند وجوہ کی بنا پر یاغستان پہنچنا ممکن نہ ہوا اور ۱۹۱۷ء میں مکہ سے گرفتار کر کے مصر بھیج دیئے گئے اور پھر انہیں سرکاری تفتیش کے بعد مالٹا بھیج دیا گیا۔ مالٹا اس وقت سیاسی قیدیوں کے لئے سب سے بڑا قید خانہ تھا، یہاں ساڑھے تین سال اسارت کے گزارے، اسی زمانۂ اسیری میں شیخ الہندؒ نے قرآن کریم کے بیس پاروں کا ترجمہ کیا اور سورۂ بقرہ وآل عمران پر حاشیہ لکھا، اس کے علاوہ بخاری کے ابواب وتراجم سے متعلق بھی ایک کتاب الابواب والتراجم تحریر فرمائی۔ یہ ترجمہ کلام پاک جس کا آغاز آپ نے علماء وفضلاء کے مسلسل تقاضوں سے شروع فرمایا تھا حج بیت اللہ اور مالٹا کی اسارت کی وجہ سے دس پارے کے ترجمہ کے بعد رک گیا، ساڑھے تین سال کی قید کے زمانے میں آپ نے اس کی تکمیل کی، اس ترجمۂ قرآن کے بارے میں مولانا محمد میاں صاحبؒ (مصنف: ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' وغیرہ) تحریر فرماتے ہیں:

''اس ترجمہ کے متعلق بس یہی کافی ہے کہ یہ ترجمہ اس مقدس بزرگ کا ہے جو بجا طور پر امام محدثین، راس مفسرین اور علمائے زمانہ کا سرتاج تھا اور اسارت مالٹا کی معتکفانہ زندگی میں کامل مراقبہ اور توجہ الی اللہ کی حالت میں ارقام فرمایا ہے، اس ترجمہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ترجمہ بامحاورہ اور تحت اللفظ ہے اور ہر قسم کی الجھن سے پاک ہے۔''

الابواب والتراجم بھی آپ کے عظیم علمی کاموں میں سے ہے کہ اس اہم کام کے لئے آپ کے پاس ایک بلا حاشیہ بخاری کا نسخہ تھا، مگر آپ کی خداداد ذہانت، رسوخ فی العلم اور محنت ولگن نے ایک وقیع علمی کام انجام دیا جو اہل علم کے یہاں ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ ۲۰ر مارچ ۱۹۲۰ء کو قید سے رہائی حاصل ہوئی، دیوبند واپس تشریف لائے، مختلف جگہوں کا سفر کیا، جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی، مسلسل سرگرم عمل رہنے کی وجہ سے آپ کی صحت متاثر رہنے لگی اور ہر دن کمزور سے کمزور تر ہوتے چلے گئے۔ ۳۰ر نومبر ۱۹۲۰ء کو یہ عالم ربانی، یہ عظیم مجاہد، مفسر قرآن اور صاحب بیعت وارشاد اپنے مالک حقیقی کے حضور سجدہ ریز ہوگیا۔

فلسفہ وحکمت کے حوالے سے ایک نام گذشتہ دوصدی سے علمی حلقوں میں گونجتا رہا ہے مولانا فضل امام۔ ضلع سیتاپور کی ایک بستی خیرآباد کے رہنے والے تھے اور یہ بستی گذشتہ صدی تک خیر البلاد کہلاتی تھی، ان

ہی فضل امام کے گھر ۱۷۹۷ء میں مولانا فضل حق کی پیدائش ہوئی، آپ کو تعلیم و تربیت کے لئے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ اور والد مرحوم جیسے نابغۂ وقت افراد کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کرنے کا موقع ملا۔ ذاتی محنت، ذہانت و ذکاوت اور حافظہ کی بنا پر علوم عقلیہ ونقلیہ میں مہارت حاصل کی اور صرف ۱۳؍سال کی عمر میں جی ہاں تیرہویں سال ہی میں مسندِ درس پر جلوہ افروز ہوگئے، کھیلنے کودنے کا زمانہ، نوعمر و کم سن کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ چھوٹا سا بچہ اور مسندِ تدریس! مگر انہوں نے اپنے علوم وکمالات سے سب کو قائل کرلیا۔ منطق وفلسفہ کے ماہر تھے اور دوسری طرف ادب وانشا اور تحریر پر بھی پورا عبور رکھتے تھے۔ عربی، فارسی، اردو کے بے نظیر شاعر تھے، تمام کتابوں پر ادبی رنگ غالب ہے۔ اور حیرت ہوتی ہے کہ ان کے پاس الفاظ وتعبیرات کا کتنا بڑا ذخیرہ ہے!! آپ کے کمالات اور تبحر وجامعیت کی وجہ سے بہادر شاہ ظفر ان سے بے حد متاثر تھے اور سیاسی مشورہ لیا کرتے تھے۔ مولانا انگریز کے ملازم تھے، اس کے بہی خواہ اور حامی ناصر تھے، لیکن جب لکھنؤ پہنچے، انگریزوں کے ظلم واستبداد کے مناظر دیکھے اور مجاہدین کی سرفروشیوں کو قریب سے جانا تو سر سے پاؤں تک انگریز دشمنی میں ڈوب گئے، ان کی زندگی ایک پرجوش داعی اور مجاہد کی صورت میں ڈھل گئی۔ لکھنؤ کو چھوڑ کر الور میں جہادِ آزادی کا نیا محاذ قائم کیا اور دہلی کی جامع مسجد میں وہ عہد ساز تاریخی فتویٰ دیا جس نے آزادی کے شعلے بھڑکا دیئے۔ ۱۹؍ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہوگیا، مولانا اس وقت دہلی ہی میں تھے، ساتھ میں ان کے اہل وعیال بھی پانچ روز تک مسلسل بھوکے پیاسے ایک مکان میں چھپے رہے، پھر ایک رات اندھیرے میں چھپتے چھپاتے نکلے اور خیرآباد کی جانب چل پڑے، اسی درمیان ملکۂ وکٹوریہ کی جانب سے عام معافی کا اعلان ہوگیا۔

خیرآباد پہنچ کر سکون کا سانس بھی لیا تھا کہ مخبری کی بنا پر مقدمہ چلا اور حاضری کا حکم ہوا اور پھر اس اقرار کے بعد کہ فتویٰ میں نے ہی دیا تھا ان کو حبسِ دوام، عبور دریائے شور، جزیرۂ انڈمان کا فیصلہ صادر ہوگیا، وہاں ان پر بے حد سختیاں ہوئیں اور طرح طرح سے انہیں ستایا اور ظلم کا نشانہ بنایا گیا، اس اسیری کے زمانہ میں الثورۃ الہندیہ اور دو قصائد کی تکمیل ہوتی ہے، اس کے علاوہ اور کتابیں بھی ہیں جو انڈمان کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھ کر لکھی گئیں، بالآخر انہیں رہائی ملی اور ۲۰؍اگست ۱۹۶۱ء کو اس جامع صفات وکمالات شخصیت نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا حسرت موہانی کی پیدائش ضلع اناؤ کے قصبہ موہان میں ۱۸۵۷ء کو ہوئی، اصل نام فضل الحسن اور

تخلص حسرت تھا، اصل نام سے زیادہ تخلص سے مشہور ہوئے۔ خود کہتے ہیں:

عشق نے جب سے کہا حسرت مجھے
کوئی لکھتا ہی نہیں فضل الحسن

یہ اپنے وقت کی ایک بلند پایہ شخصیت تھی اور اردو شعر وادب کے حوالے سے ان کا نام اعتبار کی حیثیت رکھتا ہے۔ شروع میں اپنا کلام تسلیم کو دکھاتے تھے، بعد میں موزوں طبیعت اور جولانی فکر کی وجہ سے اس رسمی استاذی و شاگردی کے سلسلہ کو ختم کر دیا۔ غزل کو نیا آہنگ اور لہجہ بخشا، فرسودہ موضوعات کو بھی اگر انہوں نے اپنایا تو اپنے خامۂ رنگیں سے اس میں نئے رنگ بھرے، نظم کی طرح نظر میں بھی ان کا ہم پلّہ مشکل سے تھا، اردوئے معلیٰ جاری کیا، ۱۹۰۸ء اپریل کے شمارے میں ایک مضمون باغیانہ ٹھہرا اور مقدمہ قائم ہو گیا، حالاں کہ مضمون حسرت موہانی کا نہ تھا، علی گڑھ کی حرمت بچانے کے لئے علی گڑھ کے بڑوں نے حسرت کے خلاف گواہی دی، سارا الزام انہوں نے اپنے سر لے لیا اور حسرت کو جیل بھیج دیا گیا، وہاں مشق سخن کا سلسلہ نہ ٹوٹا اور کہا:

ہے مشقِ سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

۱۹۰۸ء سے ۱۹۲۳ء تک ان کا ذخیرۂ اشعار احمد آباد، پونا، علی گڑھ، میرٹھ، پرتاپ گڑھ وغیرہ کی جیلوں کا رہین منت ہے، یہ تھوڑا تفصیلی تذکرہ تھا ان لوگوں کا جنہوں نے قید و بند کے زمانے میں اپنی وسعت فکر، وسعت علم، حافظہ ومطالعہ، خداداد ذہانت وذکاوت کی بنا پر کوئلوں سے وہ معرکۃ الآراء کتابیں لکھیں جو یادگار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی قبیل کے کچھ اور نام ہیں جیسے شمس الائمہ سرخسیؒ، شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، شیخ بوعلی سینا، مجدد الفِ ثانی، اسماعیل حسن منیر شکوہ آبادی، شیخ منور لاہوری، مولانا عنایت احمد کاکوری، مولانا محمد جعفر تھانیسری وغیرہ کہ جن کی اسارت کا زمانہ علم وادب کو ایسے شہ پارے دے گیا کہ قید و بند کی سختیوں، صعوبتوں، آزمائشوں کے درمیان اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لکھنے پڑھنے کے لئے جس ذہنی، قلبی اور فکری سکون و ماحول کی ضرورت ہے وہ انہیں میسر نہ تھا، ایسے عالم میں یہ ان حضرات کا ایسا کارنامہ ہے جسے تاریخ علم وادب فراموش نہیں کر سکتی۔

❁ .... ❁ .... ❁

یہ چراغ کوئی چراغ ہے نہ جلا ہوا، نہ بجھا ہوا

پروفیسر محسن عثمانی ندوی، حیدرآباد

علامہ اقبال نے قوم اسلام کا مرض ان الفاظ میں بیان کیا تھا:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو

کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

ان اشعار سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ علامہ اقبال کے زمانہ میں لوگ کتاب خواں ہوتے تھے لیکن صاحب کتاب یعنی مصنف نہیں ہوتے تھے، صاحب تحقیق نہیں ہوتے تھے، یعنی علم کے زوال کا دور شروع ہوگیا تھا۔ اس وقت مسلمانوں کا نشتر تحقیق اگر چہ کند ہوگیا تھا، لیکن پھر بھی علمی کتابیں لکھی جارہی تھیں لیکن اب زوال اس درجہ کمال تک پہونچا ہے کہ کتاب خواں پیدا ہونا بھی بند ہوگئے ہیں، اب ہاتھ سے کتاب چھوٹ چکی ہے اور اب کتاب کی جگہ موبائل نے لے لی ہے۔ فیس بک، وہاٹس اپ، یوٹیوب اور دیگر انواع واقسام کے اپلی کیشنز۔ اور اگر گھر میں ہیں تو موبائل کے ساتھ ٹیلیویزن بھی۔ پہلے راستہ چلتے ہوئے اہل اللہ ذکر میں مشغول ہوتے تھے اور اہل ادب اپنے پسندیدہ اشعار زیرلب پڑھتے تھے یا گنگناتے تھے، اب راستہ چلتے ہوئے، موٹر یا ٹرین میں سفر کرتے ہوئے بلکہ پیدل چلتے ہوئے بھی لوگ موبائل بدست یا موبائل برگوش یا نظر بر اسکرین نظر آتے ہیں۔ موبائل کے جو فائدے ہیں وہ معلوم ہیں، لیکن نقصانات، معاذ اللہ **اثـمهـما اكبر من نفعهما** یعنی نقصانات فائدے سے سوا، نفع سے ضرر کئی گنا زیادہ، قدیم سے لے کر نزول قرآن تک علم کی دنیا میں کتاب اور قلم کی اہمیت مسلم رہی ہے۔ کتاب پڑھنے میں جو ارتکاز کا فائدہ ہے اور سنجیدگی کے ساتھ غور وفکر کا جو موقعہ ملتا ہے وہ موبائل سے حاصل نہیں ہوتا ہے۔

چند روز پہلے حیدراباد کے مشہور ہدیٰ پبلیکیشنز اینڈ ڈسٹری بیوٹر جناب شکیل سے ملاقات ہوئی تھی جو پرانی حویلی میں کتاب کی دکان کے مالک ہیں، وہ کہہ رہے تھے کہ کئی بار پورا دن گذر جاتا ہے اور ایک شخص بھی کوئی ڈھنگ کی کتاب خریدنے نہیں آتا ہے کوئی آتا بھی ہے تو صرف قرآن یا اس کا کوئی پارہ خریدنے یا

وظائف اور اوراد کی کتاب لینے کے لئے۔ ہدیٰ پبلیکشنز پرانی حویلی میں کتابوں کی مشہور دکان ہے اور اس میں ہر موضوع سے متعلق کتابیں موجود رہتی ہیں۔ ناشرین اور کتاب کی دکان کے مالکین کا اب یہ رونا ہے کہ پہلے زمانہ کے لوگ کتاب پڑھتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی عنفوان شباب میں یہ عادت تھی کہ کتاب لے کر کسی صحن گلستان میں چلے جاتے تھے اور محو مطالعہ ہو جاتے تھے اور اپنی اس عادت کا تذکرہ کرتے ہوئے انہوں نے حافظ کا شعر نوٹ کیا ہے۔ ''فراغتے وکتابے وگوشۂ چمنے''۔ پھر ایک زمانہ وہ آیا جب لوگ کتاب کم اخبار زیادہ پڑھنے لگے، پھر اب وہ زمانہ آ گیا ہے کہ نہ اخبار، نہ کتاب، نہ کوئی میگزین، صرف موبائل سے لوگ شوق کرتے ہیں۔ نہ کسی مکتبہ میں جانا نہ کتب خانہ میں داخل ہونا۔ البتہ کوئی بازار ہو یا نمائش لگی ہوئی ہو تو دل کی تمام کلیاں کھل اٹھتی ہیں اور دل سوئے بازار لے چلتا ہے۔

معاشیات کی دنیا میں ''فی کس آمدنی'' کی اصطلاح بہت عام ہے یہ جملے لکھے ہوئے بہت ملتے ہیں کہ ملک میں اتنے فی صد لوگ خط غربت میں اور اتنے فی صد لوگ خط غربت سے بھی نیچے زندگی گذارتے ہیں۔ معاشیات کی اصطلاح میں ہم گفتگو کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمارے دور میں لوگ ''خط کتاب'' سے نیچے زندگی گذارتے ہیں علم اور تعلیم کا شوق سب سے کم مسلمانوں میں ہے۔ ہمارے ملک میں مسلمانوں کی آبادی کم وبیش بیس کروڑ ہے، ان میں ۲۰ لاکھ افراد بھی اخبار نہیں پڑھتے ہیں، اور ان میں دو لاکھ افراد بھی کتاب نہیں پڑھتے ہیں۔ اب کتاب خوانوں کی تعداد خطرناک حد تک گھٹ گئی ہے اور جو لوگ اخبار پڑھتے ہیں وہ بھی بس موٹی موٹی سرخیاں پڑھ لیتے ہیں، اخبارات کے مضامین اور افتتاحئے، اداریئے پڑھنے والوں کی تعداد اور بھی بہت کم ہے۔ اب بہت سے شرفاء اور اساتذہ اخبار تک نہیں پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم انٹرنٹ پر دیکھ لیتے ہیں، حالانکہ انٹرنٹ کی سہولت دراصل دوسرے شہروں اور ملکوں کے لئے ہوتی ہے، اپنے شہر کے اخبار کو خرید کر کے پڑھنا چاہئے، لیکن کیسے سمجھایا جائے:

مرگ غیرت تری دہائی ہے

اب لوگوں کے علم وشعور کی سطح نقطۂ انجماد سے نیچے پہونچ چکی ہے۔ امام غزالی نے لکھا تھا کہ انسان اگر تین دن تک مطالعہ نہ کرے تو اس کے ذہن پر مردنی چھانے لگتی ہے۔ اس قول کو قول معقول مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا اگر انسان تیس دن تک لگاتار مطالعہ نہ کرے ''توبرین ہیمرج'' کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کی صحت مند دانشورانہ زندگی کی کوئی امید باقی نہیں رہتی ہے۔ یعنی جس طرح ایک انسان اگر ۳۰ دن تک کوئی غذا نہ استعمال کرے تو اس کی جسمانی موت ہو جاسکتی ہے اس طرح کوئی شخص ۳۰ دن تک مطالعہ نہ

کرے اور کتاب نہ پڑھے تو اس کی دماغی موت واقع ہو سکتی ہے۔

جب کتاب کا مطالعہ اس وقت اس قدر اہم ہے تو آخر لوگ کتاب کیوں نہیں پڑھتے ہیں۔ کتاب نہ پڑھنا دراصل ایک طرح کی بیماری ہے۔ اس بیماری کے شکار لوگوں کو کتاب پڑھنے کی بھوک نہیں لگتی ہے۔ یہ مرض ویسا ہی ہے جیسے بعض لوگوں کو کھانا کھانے کی بھوک نہیں لگتی ہے، فرق صرف یہ کہ کھانے کی بھوک نہ لگنے کو لوگ بیماری جانتے ہیں اور اس کا علاج کرا لیتے ہیں۔ لیکن کتابوں کی بھوک نہ لگنے کو لوگ بیماری نہیں سمجھتے ہیں اور اسی بیماری کی حالت میں عمر گذار دیتے ہیں، لوگ مضمون اور کتاب پڑھنے کے آداب سے بھی واقف نہیں، اگر مضمون نگار یا مصنف کتاب بقید حیات ہے تو کتاب پڑھنے کے بعد اس سے رابطہ شرافت واخلاق کی بات ہے، تعریف یا کچھ تنقید، اعتراض یا کوئی سوال۔ کتاب رس گلے کے قسم کی مٹھائی نہیں ہے، جسے خاموشی سے حلق کے نیچے اتار لیا جائے۔ کتاب نہ پڑھنے اور بھی بہت سی بیماریاں ہیں جو اگر جسمانی نہ ہوں تو لوگ اس کو بیماری نہیں سمجھتے ہیں۔ عقیدہ اور ایمان کی بیماری، اخلاق وکردار کی بیماری انسان کو لاحق ہو جاتی ہے اور انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا ہے اور وہ خود کو صحت مند سمجھتا رہتا ہے تا آنکہ اسے موت دبوچ لیتی ہے پھر وہ وقت آئے گا جب اس کی سزا کا فیصلہ سنایا جائے گا۔ غم اور افسوس اس بات کا ہے کہ تعلیمی اداروں میں پڑھانے والے اساتذہ بہت کثرت سے اس بیماری کا شکار ہونے لگے ہیں۔ وہ ''بک'' کو اہمیت نہیں دیتے ہیں بلکہ ''چیک بک'' کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ قرطاس وقلم کو اہمیت نہیں دیتے ہیں، بینک کی رقم کو اہمیت دیتے ہیں۔

کتاب تو سب کو پڑھنی چاہئے لیکن خاص طور پر تعلیم گاہوں کے اساتذہ کے لئے تعلیم کا سب سے بڑا مقصد خود باشعور ہونا اور طلبہ کو باشعور بنانا ہے، خود کتابیں پڑھنا ہے اور طلبہ کو مطالعہ کی رہنمائی کرنا ہے۔ اس کارگہ حیات میں شعور اور احساس سب سے اہم رول ادا کرتا ہے۔ کم لوگ جانتے ہیں کہ یہ شعور اور احساس ہی ہے جو انقلاب پیدا کرتا ہے، بیداری کو عام کرتا ہے۔ اور یہ شعور اور احساس کثرت مطالعہ اور عمیق غور وفکر سے حاصل ہوتا ہے۔ سب سے بڑا جرم بے شعور ہونا ہے۔ گردوپیش میں جو حالات پیش آتے ہیں اور جن حوادث کا سامنا کرنا پڑتا ہے ان کا شعور، ان کا احساس اور ان کا ادراک ضروری ہے۔ یہی شعور ہے جس کا تفاعل Interaction جب ایکشن (حرکت وعمل) سے ہوتا ہے تو لیڈر جنم لیتے ہیں، قائد پیدا ہوتے ہیں اور رہنما سامنے آتے ہیں جو ہزاروں دلوں کو گرماتے ہیں اور جب گہرے شعور کا تفاعل ''ایموشن'' یعنی جذبہ سے ہوتا ہے تو ادیب، مقالہ نگار، شاعر، افسانہ نگار، ناول نویس اور صحافی پیدا ہوتے ہیں۔ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں کسی نہ کسی حد تک ایسے لوگ ہیں جو قومی اور ملکی معاملات میں دانشورانہ

حصہ لیتے ہیں اور فکری رہنمائی کا کام انجام دیتے ہیں اور ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جو صاحب قلم ہیں اور سماج میں ظلم وناانصافی کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ میں تعلیمی اداروں میں حالات کے شعور کا تفاعل نہ ایکشن سے ہورہا ہے اور نہ ایموشن سے نہیں ہورہا ہے، اس لئے نہ مولانا آزاد کی طرح کا کوئی قائد اور ادیب ہے اور نہ نواب بہادر یار جنگ کی طرح کا کوئی خطیب ہے۔ اب یونیورسٹی کے مسلم حلقہ سے کوئی قائد، کوئی مصلح اور کوئی رفارمر، کوئی صاحب قلم سامنے نہیں آتا ہے اور اسی طرح سے تعلیم گاہوں کے اساتذہ کے شعور کا تصادم ایموشن (جذبہ) سے نہیں ہورہا ہے، اس لئے اہل قلم نہیں پیدا ہورہے ہیں۔ ہر یونیورسٹی میں ہر سال اساتذہ سے رپورٹ مانگی جاتی ہے کہ انہوں نے کتنے سمینار میں شرکت کی، کتنی کتابیں لکھیں، کتنے مقالات لکھے۔ یونیورسٹی کے مسلم اساتذہ نے یو.جی.سی کی اس رہنمائی کو سمجھا ہی نہیں۔ یونیورسٹی یا یو.جی.سی دراصل اساتذہ سے یہ پوچھنا چاہتی تھی کہ ہم نے آپ کو صاحب علم اور صاحب شعور سمجھ کر ٹیچر کی حیثیت سے منتخب کرلیا، اب آپ بتائیں کہ ہمارے اس انتخاب کے بعد آپ کے شعور کا ٹکراؤ یا ملاپ ''ایکشن'' سے یا ''ایموشن'' سے ہوا یا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ ان اساتذہ میں اس وقت ملک میں جس طرح اور جس درجہ کے قائدین اور مصلحین یا ادیب یا اہل قلم موجود ہیں وہ دراصل شعور کے ایکشن یا ایموشن کے ساتھ تفاعل کی دین ہیں۔ لیکن ان کی تعداد بے حد کم ہے۔ آٹے میں نمک کے برابر۔ بعض اساتذہ تو ''یو.جی.سی'' کو دھوکا دینے کے لئے اور انٹرویو میں پیش کرنے کے لئے دو چار کتابیں چھپوا لیتے ہیں، جن کی تعداد اشاعت بیس پچیس سے زیادہ نہیں ہوتی ہے، پھر انہیں الماری میں بند کرکے رکھ دیتے ہیں'' تاکہ سند رہے اور وقت ضرورت کام آئے'' وہ دراصل اس خوداعتمادی سے محروم ہوتے ہیں کہ ان کی کتابیں اہل علم کے سامنے پیش کئے جانے کے لائق ہیں۔ سادہ ذہن، سادہ دل لوگ ایسے مسلم اساتذہ کو اہل علم اور روشن دماغ سمجھتے ہیں، کیونکہ ان کی وابستگی علمی ادارہ سے ہے، لیکن یہ ایسے روشن دماغ ہوتے ہیں کہ ان کی روشنی محض جگنوؤں والی روشنی ہے اور جگنوؤں کی بساط کیا۔ وہ ''چار پائے برو کتابے چند'' کے مصداق بھی نہیں۔ ایسے اساتذہ کو دیکھ کر جن کا علم نہ لازم ہے نہ متعدی، وہ کتاب خواں نہ صاحب کتاب، یہ مصرعہ زبان پر آتا ہے۔

یہ چراغ کوئی چراغ ہے ☆ نہ جلا ہوا نہ بجھا ہوا

ان کے پاس شدت شعور کا ایموشن (جذبہ) سے وہ ٹکراؤ نہیں ہوا جس کی چنگاری ادب کی تخلیق کرے ان کے پاس شعور کا ایکشن (حرکت وعمل) سے بھی ٹکراؤ نہیں ہوا جس کی وجہ سے رہبر اور قائدین سامنے آتے ہیں۔ یہ ''امت اقرأ'' کتاب خوان بننے کے بجائے موبائل بدست بن گئی ہے اس کے

نزدیک نہ قلم کی عزت ہے نہ کتاب کی ،صرف موبائل کی عزت ہے ۔حالانکہ ایک صاحب قلم کی عزت بڑے سے بڑے صاحب جبروت بادشاہوں سے بڑھ کر ہونی چاہئے ، ایک شہنشاہ قلم کی عزت ایک اورنگ نشین صاحب کروفر سلطان سے زیادہ ہونی چاہئے ، بساط قلم کے مقابلہ میں مسند عیش وتجمل کو ہیچ ہونا چاہئے افسوس کہ مسلمان علم سے دوراور تعلیم سے نفور ہیں ۔انہوں نے قلم کا سر قلم کردیا ہےاور کتاب کوحباب سے بھی کم عزت دی ہے ۔ دانش گاہوں ، مدرسوں اور یونیورسٹیوں کے اساتذہ کا حال مفلوک الحال لوگوں کی طرح ہوگیا ہے۔مفلوک الحال اسے کہتے ہیں جس کی جیب خالی ہو۔یونیورسٹیوں کے ان اساتذہ کی جیب تونہیں لیکن ان کے دماغ خالی ہیں ''نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ''جن اشخاص کی پہلی وابستگی کتاب سے ہونی چاہئے وہ صرف کتاب کی دکانوں میں نہیں جاتے ہیں باقی ہر طرح کی دوکانوں میں جاتے ہیں، وہ ''خط کتاب'' سے نیچے زندگی گذارتے ہیں ۔خط کتاب سے نیچے ہونا خط غربت سے نیچے ہونے سے بھی بدتر ہے ۔ یہ ''قابل فاضل''اساتذہ گھر سے نکل کر بازار یا بینک جاتے ہوئے نظر آجائیں گےلیکن لائبریری جاتے ہوئے کبھی نظر نہیں آئیں گے ۔ یہ ایک عام غلط فہمی ہے کہ لائبریری میں کسی خاص کتاب کوایشو کرانے کےمقصد سے جانا چاہئے حالانکہ لائبریری وہ جگہ ہے جہاں اہل علم کا غنچہ دل شگفتہ ہوتا ہے وہاں بے مقصد بھی جانا چاہئے ،صرف کتابوں کودیکھنے کے لئے ، ان کے لمس کی عزت حاصل کرنے کے لئے جانا چاہئے ، ان سے وہ رشتہ ہونا چاہئے جو عاشق کا محبوب سے ہوتا ہے ۔تعلیمی اداروں کے یہ اساتذہ اہل علم کے زمرے میں شمار کئے جانے کے لائق نہیں۔تعلیمی اداروں سے وابستگی کی وجہ سے دوسروں کواور خود ان کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ ان کا شمار اہل علم میں ہے،اس غلط فہمی کو دور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ خود کواگر کسی صورت سے ممکن ہو علمی ادارے سے الگ کرلیں یا کسی اجنبی سرزمین میں چلے جائیں اور پھر غور کریں کہ لوگ ان کا ایک اسکالراور دانشور کی حیثیت سے احترام کرتے ہیں یا نہیں ۔ احترام ادارے کی نسبت سے ہوتو وہ قابل اعتبار نہیں ۔مزید تفہیم کے لئے یہ عرض ہے کہ اردو ادب میں شمس الرحمٰن فاروقی یا مجتبیٰ حسین کا علمی یا ادبی احترام ان کی علمی اور ادبی خدمات کی وجہ سے ہے، کسی ادارہ کی نسبت کی وجہ سے نہیں، یا اسلامیات میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا اعتراف ان کے تصنیفی کام کی وجہ سے ہے کسی ادارہ سے نسبت کی وجہ سے نہیں ۔علمی اداروں کے اساتذہ سے کچھ اسی انداز کی چیز مطلوب ہے ۔یعنی ان کا اعتراف ان کے علمی ادبی کاموں کی وجہ سے کیا جانا چاہئے ، نہ کہ ادارے سے وابستگی کی بنیاد پر۔سچ یہ ہے کہ اپنے ناموں کے ساتھ عہدوں کا یا ڈگریوں کا تذکرہ کرنا، جیسے ڈاکٹر، پروفیسر، (رٹائرمنٹ کے بعد پروفیسر لکھنا قطعی درست نہیں مگر یہ کہ کسی نام کی شناخت اس سے ہوجائے تو مجبوری ہے اعظم گڑھ کے بھی ایک

صاحب محسن عثمانی تھے جومضامین لکھتے تھے،ابتداء میں ان سے امتیاز کے لئے پروفیسر لکھا گیا تھا)اور ہڈ آف دی ڈپارٹمنٹ یاڈین وغیرہ لکھنا یہ سب ہائی ہیلڈ سینڈل کے مانند ہے جسے اکثر خود کو درازقد ثابت کرنے کے لئے خواتین استعمال کرتی ہیں ان عہدوں کے ذکر کے بغیر یہ اساتذہ خود کو پست قد اور غیر علمی شخصیت محسوس کرتے ہیں اور دوسرے بھی انہیں قدآور اوراسکالر نہیں سمجھتے ہیں بقول غالب

بھرم کھل جائے ظالم تیری قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پر پیچ وخم کا پیچ وخم نکلے

علمی اداروں کے اساتذہ اکثر نااہل اور ناتربیت یافتہ ہوتے ہیں۔ یہ اساتذہ خود ناتربیت یافتہ ہیں طلبہ کی تربیت کیا کریں گے وہ طلبہ کو لکھنے کے لئے وہ موضوعات دیں گے جو بے نفع ہیں(**اللھم انی اعوذ بك من علم لا ینفع**) ان اساتذہ کا حال یہ ہے کہ ملت کے مسائل سے متعلق کہیں کوئی پروگرام ہو وہ اس میں نہ خود شرکت کریں گے نہ طلبہ کو شرکت کا مشورہ دیں گے۔ان تعلیم گاہوں کے کیمپس کے باہر ملت کے مسائل سے وابستگی دلچسپی رکھنے والے مل جائیں تو مل جائیں لیکن یونیورسیٹیوں کے کیمپس میں نہیں ملیں گے۔ان اساتذہ کا ایمان کمزور ہے زبان حال سے کہتے رہیں گے سی آئی ڈی کے لوگ ان کے پیچھے پڑ جائیں گے۔جس طبقہ کو ملت کی قیادت کرنی تھی وہ بے سبب حکومت سے خوف زدہ رہتا ہے یہ طبقہ قلم اور کتاب سے بھی اس قدر دور ہے کہ اپنے احساسات کو لفظوں کے سانچے میں ڈھالنا بھی اسے نہیں آتا ہے۔ یہ طبقہ خود ہی بے شعور ہے۔اور صرف غلطی سے یا سوء اتفاق سے اسے علمی ادارے میں جگہ مل گئی ہے اور اگر کسی درجہ میں شعور ہے اور علم ہے تو اس شعور اور علم کا تفاعل نہ کبھی ایکشن سے ہوا نہ ایموشن سے ہوا یعنی وہ نہ اجتماعی قیادت کے میدان میں ہے نہ وہ صاحب قلم ہے۔ وہ محض سڑک کی بھیڑ کا ایک فرد ہے۔علمی ادارہ میں رہ کر بھی وہ کتابوں سے دور ہے۔ کتابوں سے دوری ایک طرح کا خطرناک وائرس ہے جو یونیورسیٹی کی موٹی موٹی تنخواہوں کے گڈی میں چھپا رہتا ہے اور ان اساتذہ کی عقلی اور فکری صحت پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔

وہ سورہ جو سب سے پہلے نازل ہوئی اس کی پہلی آیت میں اقرا یعنی پڑھنے کا حکم ہے قرآن کی اس سورہ میں قلم کا بھی تذکرہ ہے "**علم بالقلم**" قرآن میں ایک جگہ قلم کی قسم بھی کھائی گئی ہے **ن والقلم وما یسطرون**. ان آیتوں سے کتاب کی اور قلم کی اور تعلیم کی اور علم کی عظمت معلوم ہوتی ہے اور دنیا میں قومیں قلم اور کتاب ہی سے ترقی کرتی ہیں لیکن ہم ہیں کہ قعر مذلت میں پڑے ہوئے ہیں۔لذت علم سے نا آشنا اور اور شوق علم سے بیگانہ۔

❁ .... ❁ .... ❁

مولانا حسیب صدیقی: ایک ممتاز شخصیت

عمر الٰہی عثمانی
دارالعلوم وقف دیوبند

چند ہی افراد ہوتے ہیں جو دنیا سے چلے جانے کے بعد لوگوں کے دلوں میں زندہ رہتے ہیں، جن کی موت سے پوری بستی ماتم کدہ میں تبدیل ہوجاتی ہے، ہر گھر میں سوگ پسر جاتا ہے، کئی گھروں کے چولہے ٹھنڈے ہوجاتے ہیں اور ہر شخص یہ محسوس کرتا ہے کہ آج میں یتیم ہوگیا، ملت کے سر سے سرپرستی کا سایہ اٹھ گیا، ایک مخلص قائد ورہنما رخصت ہوگیا۔ ایسے ہی لوگوں کی صف میں مولانا حسیب صدیقی صاحب علیہ الرحمہ (سابق منیجر مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند) کا نام شامل ہے، جن کے نام کے ساتھ 'سابق منیجر' یا 'علیہ الرحمہ' لکھتے ہوئے قلم لرزاں ہے، انگلیاں کانپ رہی ہیں اور دل غمگین ہے۔

گوراچٹا رنگ، خوبصورت چہرہ، گھنی سفید اور پُرنور داڑھی، خوبصورت اور چمک دار آنکھیں اور پھر اُن پر خوبصورت چشمہ، آنکھوں میں سرمہ، سر پر دیوبندی ٹوپی، تن پر شیروانی جو اُن پر جچتی تھی اور اُن کے حسن کو دوبالا کرتی تھی، درمیانہ قد، اسلاف واکابر کے طرز پر میانہ روی۔ یہ تھا حسیب صاحب کا حلیہ جن کو تقریباً نصف صدی سے زائد ہر آنکھ اور ہر فرد بشر نے مسلم فنڈ ٹرسٹ کی مسند پر براجمان دیکھا، آج بھی مسلم فنڈ میں داخل ہوتے ہی ایسا لگتا ہے کہ بھائی حسیب کی زیارت ہوگی۔

حسیب صدیقی صاحب ۱۵راگست ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئے، اُن کے والد منشی عزیز صاحب مرحوم انچارج دفتر تعلیمات دارالعلوم دیوبند تھے، آپ کی تعلیم کی ابتداء دارالعلوم دیوبند سے ہوئی، بسم اللہ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے کرائی، دارالعلوم دیوبند سے سند فراغت حاصل کی اور پھر عصری علوم کی دنیا میں قدم رکھا، ۱۹۵۵ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا، ۱۹۵۹ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرنے کے بعد جامعہ اردو علی گڑھ سے ادیب، کامل (مساوی بی-اے) پاس کرکے تعلیم کی تکمیل کی اور پھر عملی میدان میں قدم رکھا۔ حسیب صدیقی صاحب اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک تحریک اور جہد مسلسل کا عنوان تھے۔ مستقل

مزاجی اور صبر وتحمل کا کوہِ گراں تھے۔ حسیب صاحب کی محنت، لگن، مسلسل جدوجہد اور کوشش کا اندازہ مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کے قیام اور اس کے استحکام سے لگایا جاسکتا ہے۔

۱۹۶۱ء میں حسیب صدیقی صاحب نے ایک چھوٹی سی دوکان میں مسلم فنڈ ٹرسٹ قائم کیا، اُس وقت اِس ادارہ کے منیجر بھی وہی، کلرک بھی وہی، ٹائپسٹ بھی وہی اور محصل بھی وہی شخص تھا جو نصف صدی تک اس مسند پر آب وتاب کے ساتھ جلوہ افروز رہا اور اِس عوامی اور ہنگامی سیٹ پر رہتے ہوئے کبھی کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیا۔ جو شخص بھی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں بھائی حسیب کے دفتر میں داخل ہوتا وہ اُن سے بات چیت اور گفتگو کرنے کے بعد مطمئن ہوکر باہر آتا۔

حسیب صدیقی صاحب کی مسلسل جدوجہد سے یہ پودا رفتہ رفتہ پروان چڑھتا رہا اور وہ اس کی آبیاری کرتے رہے۔ آج یہ پودا ایک ایسے تناور درخت کی شکل میں ہے جس کی شاخوں پر پھل ہی پھل ہیں۔ دیوبند کے بہت سے گھرانے اس ادارہ سے وابستہ ہوکر آسانی کے ساتھ گزر بسر کررہے ہیں۔ حسیب صاحب کے نزدیک اس ادارہ کے قیام کا مقصد صرف اور صرف یہ تھا عوام میں پیسوں کی بچت کا مزاج بنے اور غریب عوام اپنی محنت کی کمائی سے تھوڑا تھوڑا پیسہ بچا کر جمع کریں تا کہ وہ بوقت ضرورت قرض جیسی مصیبت سے بچ سکیں۔ اور اگر قرض کی نوبت آ بھی جائے تو وہ اپنے زیورات مسلم فنڈ میں رکھوا کر بلاسودی قرض حاصل کرسکیں اور اُن مہاجنوں کے سودی قرض سے بچا جاسکے جو پہلے زیور رکھ کر قرض مہیا کراتے ہیں اور پھر رفتہ رفتہ سود اتنا بڑھ جاتا ہے کہ غریب آدمی اپنے زیورات اونے پونے میں بیچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اس طرح حسیب صاحب نے مہاجنوں کے سودی قرض سے عوام کو نجات دلائی۔ حسیب صاحب کی امانت ،دیانت اور ہمدردی کا حال یہ تھا کہ قرض کی متعینہ مدت پوری ہوجانے کے بعد اُن کو کلّی اختیار تھا کہ وہ زیورات کو فروخت کرکے ادارہ کی رقم وصول کرلیں اور بقیہ رقم مقروض کو ادا کردیں، لیکن حسیب صاحب ادارہ کی طرف سے نوٹس پر نوٹس بھیجتے رہتے کہ ''آپ کی مدتِ قرض پوری ہوچکی، اپنا زیور چھڑالیں'' لیکن نصف صدی پر محیط حسیب صاحب کے دور میں کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ انہوں نے میرا زیور فروخت کردیا۔ بھائی حسیب پر عوام کے اعتماد کا حال یہ ہے کہ مسلم فنڈ کے کھاتہ دار اپنی رقومات جمع کرکے کاپی بھی وہیں رکھوا کر چلے جاتے ہیں اور جب دوبارہ رقم نکالنے کی ضرورت ہوتی ہے تو کاپی بھی دفتر سے ہی حاصل کرتے ہیں۔ حسیب صاحب نے مسلم فنڈ کے تحت چھوٹے مزدور یا صنعت کار جیسے رکشا پولر، رہیڑی والے، پنواڑی اور کمپیوٹر آپریٹر جیسے لوگوں کے لئے چھوٹی قرض اسکیم بھی چلائی تا کہ اس طرح کے چھوٹے

لوگ قرض لے کر اپنے روزگار کو مستحکم اور مضبوط کر سکیں یا چھوٹے موٹے نئے کاروبار کے ذریعے خود کفیل بن سکیں اور اس قرض کی ادائیگی یومیہ یا ماہانہ ادا کر دیں اور وہ بھی مسلم فنڈ کا محصل ہی وصول کرتا تھا، اس اسکیم سے بہت سے لوگوں نے فائدہ اٹھایا۔ حسیب صاحب نے اس طرح سے عوام کے درمیان اپنا اعتبار اور اعتماد قائم کیا اور ان کی یہ کوشش مسلم فنڈ تک ہی محدود نہ رہی۔ انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے تعلیمی میدان میں قدم رکھا، بھائی حسیب اس شعر کا مصداق تھے:

جس دن سے چلا ہوں مری منزل پہ نظر ہے ☆ آنکھوں نے کبھی میل کا پتھر نہیں دیکھا

حسیب صاحب نے ۱۹۷۱ء میں پبلک نرسری اسکول محلّہ ابوالمعالی میں واقع 'کوٹھی والی' عمارت میں قائم کیا، جس کا مقصد مسلم بچیوں کو عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم سے آراستہ کرنا تھا۔ چند سالوں میں اس اسکول کو اتنی مقبولیت حاصل ہوئی کہ یہ عمارت اسکول کے لئے ناکافی محسوس ہونے لگی تو پھر محمود ہال کے پاس اپنی جگہ پر اسکول تعمیر کر کے اس کو منتقل کر دیا۔ اُس وقت کا یہ نرسری اسکول آج پبلک گرلس انٹر کالج کی شکل میں موجود ہے اور اپنی تعلیمی مہمات میں مصروف ہے۔

حسیب صاحب نے مسلم فنڈ ٹرسٹ کے تحت درج ذیل ادارے قائم کئے۔

(۱) پبلک گرلز انٹر کالج (قائم شدہ ۱۹۷۱ء)، (۲) مسلم فنڈ کمرشیل انسٹی ٹیوٹ (قائم شدہ ۱۹۸۰ء)، (۳) مدنی آئی ٹی آئی اسپتال (قائم شدہ ۱۹۸۶ء)، (۴) مدنی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ (قائم شدہ ۱۹۹۱ء)، (۵) مسلم فنڈ برانچ، ناگل (قائم شدہ ۱۹۹۶ء)، (۶) موٹر ڈرائیورنگ ٹریننگ سینٹر (قائم شدہ ۲۰۰۴ء)، (۷) اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی سینٹر (قائم شدہ ۲۰۰۸ء)، (۸) مدنی ٹیکنیکل لائبریری (قائم شدہ ۲۰۰۸ء)، (۹) دیوبند نیوز نیٹ ورک (قائم شدہ ۲۰۱۱ء)، (۱۰) مسلم فنڈ ہیلتھ کیئر سینٹر، ناگل (قائم شدہ ۲۰۱۷ء)

متعدد اور مستحکم ادارے کوئی بڑی اور مؤثر تنظیم یا ہمہ جہت تحریک ہی قائم کر سکتی ہے جوا کیلے حسیب صاحب نے اپنے دم پر قائم کئے۔ ان تمام اداروں اور ان پر مامور افراد پر حسیب صاحب کی بیک وقت نظر رہتی تھی۔

حسیب صدیقی صاحب کا مدنی خاندان سے گہرا تعلق اور لگاؤ تھا۔ وہ ہمیشہ جمعیۃ علماء ہند کے مختلف عہدوں پر قائم رہتے ہوئے سیاسی، تعلیمی اور اقتصادی میدان میں سرگرم عمل رہے۔

ان تمام مصروفیات کے باوجود جب ۲۰۰۷ء میں دیوبند کو ایک قائد اور رہنما کی ضرورت شدت سے محسوس ہوئی تو دیوبند کے کچھ معزز اور باحیثیت افراد بھائی حسیب کے در پر حاضر ہوئے اور ان سے دست بستہ درخواست کی کہ دیوبند کو ایک قائد اور قیادت کی سخت ضرورت ہے اور ہماری آنکھیں آپ جیسی شخصیت

کو دیوبند کا چیرمین دیکھنا چاہتی ہیں۔ بھائی حسیب نے ابتداءًا تو منع ہی کیا کہ نہ یہ میرا میدان ہے، نہ مزاج اور نہ میرے پاس وقت ہے اور حقیقت بھی یہی تھی کہ جس منصب پر بھائی حسیب براجمان تھے چیرمینی کا عہدہ اس کے مقابلے میں ہیچ تھا، لیکن لوگوں کا اصرار اتنا بڑھا کہ مجبوراً انہیں الیکشن کے میدان میں قدم رکھنا پڑا۔ حسیب صاحب نے سماجوادی پارٹی کے ٹکٹ پر چیرمینی کا الیکشن مضبوطی کے ساتھ لڑا، راقم السطور بھی ان کے ساتھ الیکشن کے سلسلے میں کاندھے سے کاندھا ملا کر دیوبند کی گلیوں اور سڑکوں کی خاک چھانتا پھرا، مجھے حیرت ہوتی تھی کہ حسیب صاحب جیسے ضعیف اور کمزور آدمی پورے دیوبند میں پیدل جلسے جلوس کرتے پھر رہے ہیں، بھیڑ کا عالم ہے، دھکا مکی ہو رہی ہے؛ لیکن حسیب صاحب ہیں کہ نہ چہرے پر گرانی ہے نہ تھکن کے آثار۔ رفقاء کار کی ایک ہی دُھن، ایک ہی لگن اور ایک ہی جذبہ تھا خدا کرے حسیب صاحب چیرمین بن جائیں، حسیب صاحب کامیاب ہو جائیں۔ چیرمینی کے الیکشن میں ''یا مقدر یا نصیب، بھائی حسیب بھائی حسیب''، ''دیوبند کا چیرمین کیسا ہو، بھائی حسیب جیسا ہو'' جیسے نعرے لوگوں کی زبان زد تھے۔ آخر اللہ تعالیٰ نے بھائی حسیب کو کامیابی سے ہم کنار کیا اور انہوں نے بھارتیہ جنتا پارٹی کے مضبوط امیدوار کو شکست دی۔ دیوبند کی قیادت ان کے ہاتھوں میں آئی۔ بحیثیت چیرمین (۲۰۰۷ء تا ۲۰۱۲ء) پانچ سال انہوں نے کامیابی کے ساتھ مکمل کئے۔ حسیب صاحب نے دیوبند جیسے چھوٹے قصبے میں رہتے ہوئے عالمی سطح کے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اُن کے دنیا سے رخصت ہو جانے سے دیوبند کے ایک سنہرے باب اور زریں عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ تاریخ میں حسیب صدیقی کا نام جلی عنوان سے لکھا جائے گا۔ حسیب صاحب کے تذکرے کے بغیر دیوبند کی تاریخ ہمیشہ ادھوری رہے گی۔

حسیب صاحب کے بعد ان کی کمی عموماً اہل دیوبند اور خصوصاً ہم لوگوں کو شدت سے محسوس ہو رہی ہے۔ یہ قحط الرجال کا دور ہے، جو چلا گیا وہ اپنا خلا چھوڑ گیا، اس کا پُر ہونا ناممکن نہ سہی لیکن مشکل ضرور ہے۔ اللہ تعالیٰ حسیب صاحب کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کے قائم کردہ اداروں کو اُن کے لئے صدقۂ جاریہ اور ذریعۂ مغفرت بنائے۔ آمین

آخر میں دست بدعا ہوں اللہ تعالیٰ اُن کے صاحبزادے سہیل صدیقی صاحب منیجر مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند کو ان کا جانشین بنائے کہ وہ حسیب صاحب کے قائم کردہ تمام اداروں کی اسی طرح آبیاری کرتے رہیں جس طرح ان کے والد مرحوم کرتے رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو استحکام بخشے، والد محترم کی طرح مقبولیت عامہ عطا فرمائے اور شرور وفتن سے محفوظ رکھے۔ آمین

❁ .... ❁ .... ❁

نقد ونظر

ناقد: مولانا فضیل احمد ناصری

نام کتاب : رسائل ابن یامین (۲رجلدیں) مصنف : مولانا ندیم احمد انصاری

صفحات: جلداول ۴۰۰،جلد ثانی ۴۰۰ (قیمت ۸۰۰روپے) ناشر: الفلاح اسلامک فاؤنڈیشن، انڈیا

اسلام جامع اور ہمہ گیر مذہب ہے، یہ زندگی کے تمام گوشوں پر واضح روشنی ڈالتا ہے، امت کی رہبری کے لئے قرآن اول نمبر پر ہے اور ذخیرۂ احادیث دوسرے نمبر پر ہے، پھر اجماع اور قیاس کا نمبر آتا ہے۔ یہ چاروں مصادر ''ادلۂ اربعہ'' کہلاتے ہیں۔ ہر نئے پیش آمدہ مسائل کے حل کے لئے بالترتیب انہیں کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہ مصادر کسی بھی موقع پر خاموش نہیں رہتے، ان کی رہبری اور قبلہ نمائی جاری رہتی ہے۔کل بھی سارے مسائل کا حل انہیں کے پاس تھا، آج بھی گتھیاں یہی سلجھارہے ہیں، کل بھی گرہ کشائی انہیں سے وابستہ رہے گی۔ پورے اسلام پر عمل درآمد کے لئے ان چاروں اصولوں سے مربوط رہے توسفرِ زندگی راہِ راست پر گامزن رہے گا، ورنہ اِدھراُدھر بہک جائے گا۔

دنیا کے بیشتر مسلمان اِن اصولوں کو مانتے ہیں، انہیں نواجذ سے پکڑے ہوئے ہیں، انہیں کی روشنی میں اسلامی زندگی گزار رہے ہیں، مگر اسی زمین کے اوپر اور اسی آسمان کے نیچے انسان نما کچھ مخلوقات وہ بھی ہیں جو قرآن وحدیث کے سوا کسی کو نہیں مانتیں۔ان کے خیال میں مستند صرف یہی دونوں ہیں، بقیہ دو اصول تو ان کی نظر میں وہ کسی کام کی چیز نہیں، خودساختہ ہیں، اختراعی ہیں، اس لئے ناقابل قبول ہیں۔ ایسے لوگ خود بھی ہوش رفتہ ہوتے ہیں اور دوسروں کے لئے بھی گڑھے کھودنے کا کام کرتے ہیں۔انہیں اربابِ تقلید کا بیان کردہ ہر مسئلہ خارج از شرع نظر آتا ہے، چناں چہ جہاں انہیں موقع ملے، چوکیں گے نہیں، مقلدین سے وہ الجھیں گے، ان سے مباحثے کریں گے، عوام الناس کو شکوک میں ڈالیں گے، ایسے

نفوس کی تفہیم کے لئے ہر عہد میں اقدامات کئے گئے، تقریری بھی اور تحریری بھی اور ان اقدامات نے ہر مسئلہ کو اچھی طرح منقح کر دیا۔

یہ بھی اسلام کی ایک خدمت ہے اور بڑی مبارک و مسعود خدمت، جوں جوں وقت آگے بڑھے گا، یہ ضرورت بڑھتی جائے گی اور امت کے باصلاحیت افراد کو اس کے لئے کمر بستہ ہونا پڑے گا۔

زیر نظر کتاب ''رسائل ابن یامین'' فاضل نوجوان محترم جناب مولانا ندیم احمد انصاری زید مجدہم کے قلم سے ہے۔ کتاب دو جلدوں میں ہے اور ۳۰ر چھوٹے چھوٹے رسائل پر مشتمل۔ جلد اول میں دس موضوعات پر مفصل بحثیں ہیں جب کہ ثانی میں ۲۰ر موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ایمان و اسلام میں فرق، قربانی محض سنت نہیں واجب ہے، شب محمود، ختم قرآن کتنے دن میں؟ جمعے کے دن زوال کا حکم، یہ اور ان کے علاوہ اہم موضوعات پر تفصیلی کلام کیا گیا ہے۔ ہر موضوع پر اس کا مالہٗ و ماعلیہ کو خوب ملحوظ رکھا گیا ہے۔ احناف کے علاوہ شوافع اور موالک کے موقف پر بھی بھرپور روشنی ڈالی گئی ہے۔ اقوالِ ائمہ کو جمع کر کے ان میں محاکمہ کیا گیا ہے۔ یہ ساری باتیں باحوالہ ہیں۔ اندازِ بحث سنجیدہ ہے، طرزِ استدلال علمی ہے، طریقۂ اظہار دل نشیں ہے۔ کتاب مطالعہ سے تعلق رکھتی ہے۔

مصنف کتاب کے قلم سے چند دیگر کتابیں بھی منظر عام پر آ چکی ہیں، ان کی تصنیف کی خاص بات یہ ہے کہ اس پر نہ صرف یہ کہ اکابر علماء و فقہاء کی تائیدات و توثیقات ثبت ہیں بلکہ کتاب کے سارے رسائل مستند اور قابل قدر شخصیات کی نگاہوں سے انہیں حرفاً حرفاً گزارا گیا ہے۔ مصنف کے مطابق دونوں جلدوں کی ضخامت ایک ہے، طباعت معیاری ہے، ترتیب و تزئین جاذبِ نظر ہے، مجلّٰی باطن اور حسین ظاہر کے ساتھ یہ تحفۂ علمی اہل علم و فضل کی خدمت میں پیش ہے۔ ہر صاحب حق کو اس کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

❁ .... ❁ .... ❁

جامعہ کی سرگرمیاں

مولانا فضیل احمد ناصری
استاذ حدیث و نائب ناظم تعلیمات جامعہ ہٰذ

تعطیلِ ششماہی کے اختتام کے بعد تعلیم کا آغاز

حسبِ سابق امسال بھی ششماہی تعطیل رہی۔ تعطیل ۲۹ر سے ۱۱ر دسمبر 2018ء تک رہی۔ قریب و دور کے اکثر طلبہ اپنے اپنے وطن عزیز چلے گئے اور وقتِ مقررہ پر واپس لوٹ آئے۔ ۱۳ر دسمبر کو ہر جماعت کی روکی گئی ایک کتاب کا تحریری امتحان ہوا اور اگلے دن سے تعلیم کا باقاعدہ آغاز ہو گیا۔

ششماہی امتحان کے نتائج

ہمیشہ کی طرح اس امتحان میں بھی دارالعلوم، وقف دارالعلوم دیوبند سمیت اطراف کے ممتاز اساتذہ کو مدعو کیا گیا، جنھوں نے ہمہ پہلو امتحان لے کر طلبہ کی تیاریوں سے آگاہ کیا اور مفید مشوروں سے نوازا۔ امتحان کے نتائج آویزاں ہو چکے ہیں، نتائج بحیثیت مجموعی الحمدللہ حوصلہ بخش اور امید افزا رہے۔ حضرات ممتحنین نے جن کمزور گوشوں کی طرف نشان دہی کی ہے انہیں مہر بند لفافے میں متعلقہ اساتذہ تک ارسال کر دیا گیا ہے۔

پوزیشن لانے والے طلبہ

درجۂ حفظ: الیاس احمد کشمیر (اوّل پوزیشن)، محمد مشتاق عالم مدھوبنی (دوم پوزیشن)، عبدالصمد دہلی (سوم پوزیشن)

درجۂ ناظرہ: محمد حسن گڈا (اوّل پوزیشن)، محمد عفان چوہان، سہارن پور (دوم پوزیشن)، محمد صابر عالم پورنیہ (سوم پوزیشن)

درجۂ اعدادیہ :خبیب انور سہارن پور(اوّل پوزیشن)،محمد آصف کبیر نگر(دوم پوزیشن)،محمد اظہر انصاری جھارکھنڈ(سوم پوزیشن)

عربی اوّل :نوشاد خان ایم پی(اوّل پوزیشن)،تقی احمد ارریہ(دوم پوزیشن)،توقیر عالم سوپول (سوم پوزیشن)

عربی دوم : محمد شعبان علی لکھنؤ (اول پوزیشن)،محمد افضال لکھنؤ (دوم پوزیشن)،فضیل احمد پنجاب(سوم پوزیشن)

عربی سوم : عبدالرحمٰن مہراج گنج(اوّل پوزیشن)،محمد اسعد انصاری گریڈیہہ(اوّل پوزیشن)،عبدالرؤف ہریدوار(دوم پوزیشن)،منیر ہریدوار(سوم پوزیشن)

عربی چھارم:محمد ارمان نہال کوڈرما(اوّل پوزیشن)،محمد اسلم کشن گنج(دم پوزیشن)،عباس خان بھوپال(سوم پوزیشن)

عربی پنجم:شمیم احمد ملا بنگال(اوّل پوزیشن)،عبدالعزیز اڑیسہ(دوم پوزیشن)،منتظر مظفر نگر، (سوم پوزیشن)

دورۂ حدیث شریف :بدام انس شفیع گجرات(اوّل پوزیشن)،عبدالرحمٰن اڑیسہ(دوم پوزیشن)، الیٹھا محمد حنیف گجرات(سوم پوزیشن)

تکمیل ادب : محمد سلیم کبیر نگر(اوّل پوزیشن)،محمد ساجد امبیڈ کرنگر(دوم پوزیشن)،شیخ معراج الاسلام مغربی بنگال(سوم پوزیشن)

تکمیل افتاء : رفیق الاسلام مغربی بنگال(اوّل پوزیشن)،غلام رسول خاں کشمیر(دوم پوزیشن)، محمد مستقیم بستی(سوم پوزیشن)

سخت سردی کے پیش نظر یک وقتی نظام تعلیم کا نفاذ

جامعہ میں درس گاہی تعلیم دو مرحلوں میں ہوتی ہے،صبح کا تعلیمی دورانیہ چار گھنٹوں پر مشتمل ہے اور شام کا دورانیہ دو گھنٹوں پر۔یہی نظام کم وبیش پورے سال رہتا ہے،لیکن کڑاکے کی ٹھنڈ کے موسم میں دن چھوٹا ہونے کی بنا پر چند ماہ کے لئے یک وقتی نظام نافذ کر دیا جاتا ہے۔رواں سال بھی ششماہی امتحان کی تعطیل کے بعد یہ نظام جاری ہے۔

احقر فضیل احمد ناصری بحیثیت ممتحن کھجناور میں

احقر فضیل احمد ناصری بحیثیت ممتحن مولانا محمد ابرار ندوی صاحب کی دعوت پر مدرسہ دارالقرآن دیدار شاہ پہنچا۔ اس سفر میں دارالعلوم وقف دیوبند کے استاذ اور معروف اہل قلم مولانا نسیم اختر شاہ قیصر صاحب بھی شریک رہے۔ کھجناور شمال مغرب میں واقع ایک تاریخی قصبہ ہے، جو دیوبند سے ۶۰ رکلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے ہاتھوں قائم کردہ ادارہ ''مدرسہ عزیز القرآن'' بھی واقع ہے۔ یہ گاؤں مشہور صاحبِ نسبت بزرگ شاہ یعقوب مجددی بھوپالیؒ کی سسرال بھی ہے۔ متعدد اہل علم یہاں موجود ہیں اور دینی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ جن طلبہ کا امتحان لیا گیا وہ درجۂ حفظ کے تھے۔ امتحان اچھا رہا، طلبہ کے جوابات تشفی بخش اور تہذیب وشائستگی قابلِ تعریف رہی۔

تقسیم لحاف

جامعہ میں غریب ونادار طلبہ کی لحاف سے مدد کرنے کی روایت بھی اول یوم سے جاری ہے۔ چنانچہ موسم سرما شروع ہوتے ہی کمزور اور خستہ حال طلبہ کو معیاری لحاف دیئے گئے۔ ناظم دارالاقامہ محترم جناب مولانا ابوطلحہ اعظمی صاحب نے مستحق طلبہ کا انتخاب کرکے ان کی ضرورت کی تکمیل کی۔ یہ لحاف جامعہ کے سابق صدرالمدرسین حضرت مولانا عبدالرشید صاحب بستویؒ کے اہل خانہ اور محترم جناب مولانا محمد سعدان جامی صاحب زیدمجدہم استاذ جامعہ ہذا کی طرف سے فراہم کرائے گئے۔ **فجزاھم اللہ احسن الجزاء.**

سالانہ انعامی اجلاس بابت ۱۴۳۹ھ کا اعلان

طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لئے جامعہ میں سالانہ انعامی اجلاس کی بھی ایک روایت رہی ہے۔ اسی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے اگلے انعامی اجلاس کا اعلان کردیا گیا۔ یہ اجلاس ۲۱رفروری ۲۰۱۹ء کو منعقد ہوگا، جس میں دیوبند کی اہم علمی شخصیات کی شرکت بھی ہوگی۔

جامعہ میں حوصلہ افزائی کے یہ جلسے طلبہ کے لئے بہت اہم ہوتے ہیں۔ ہر جماعت کے ممتاز طلبہ کو گراں قدر انعامات سے نوازا جاتا ہے۔ یہ انعامات بصورت کتب ہوتے ہیں۔ عام طلبہ کو بھی تشجیعی انعامات سے نوازا جاتا ہے، ممتاز طلبہ کو نقد روپے بھی بطور انعام دیئے جاتے ہیں۔ پچھلے سال کم وبیش ڈیڑھ لاکھ روپے کے انعامات تقسیم کئے گئے تھے۔

’’رواقِ انظر‘‘ کی تعمیر کا جنگی پیمانے پر آغاز

پچھلے ماہ ’’رواقِ انظر‘‘ کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا، اب اس کی تعمیر کا کام جنگی پیمانے پر جاری ہے۔ جامعہ میں اس عمارت کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ جامعہ کے پاس قدیم دارالاقامہ تو ضرور ہے، مگر اس میں بہت زیادہ طلبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی بنا پر بیشتر طلبہ داخلہ سے محروم رہ جاتے تھے۔ دارالاقامہ کی یہ تعمیر ان شاء اللہ بہت حد تک ضرورت کی تکمیل کرے گی۔ یہ عمارت تین منزلہ اور اس میں کم و بیش ۴۶ کمرے ہوں گے۔ انور ہال کی طرح یہ جدید عمارت بھی خوش منظر اور دلفریب ہوگی۔ اس کی تعمیر تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ فخر المحدثین حضرت مولانا سید محمد انظر شاہ کشمیریؒ بانی جامعہ ہٰذا کی طرف اس کو منسوب کیا گیا ہے۔ انور ہال کے مشرقی قطعۂ اراضی پر یہ تعمیر نہایت برق رفتاری کے ساتھ چل رہی ہے، قارئین سے اس کی جلد از جلد تکمیل کے لئے دعا کی درخواست ہے۔

یوم جمہوریہ کے موقع پر اجلاس

جامعہ نے یوم جمہوریہ کے موقع پر حسب روایت اجلاس کا انعقاد کیا، جس میں حضرات اساتذہ اور طلبہ نے شرکت کی۔ اساتذہ نے اپنی تقریروں میں کہا کہ اس طرح کے مواقع ملکی تاریخ کو سمجھنے اور اسلاف کے کارنامے تازہ کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ یہ ملک ہمارے آباء واجداد نے خونِ جگر سے سینچا اور ہر طرح سے پروان چڑھایا۔ انگریزی تسلط ہوا تو ہمارے قائدین نے سرفروشی کی۔ محترم جناب مولانا نثار خالد صاحب دیناجپوری زیدمجدہم کی دعاء پر اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

حضرت مولانا شیث احمد صاحب مظاہری کے لئے دعائے صحت

جامعہ کے استاذ حدیث اور بزرگ شخصیت حضرت مولانا شیث احمد صاحب مظاہری زیدمجدہم کی طبیعت اچانک بگڑ گئی اور دیر تک ان پر غشی طاری رہی۔ نہایت پھرتی سے انہیں شہر کے ممتاز مستشفیٰ ڈی کے جین ہسپتال لے جایا گیا جہاں ڈاکٹروں نے انہیں آئی سی یو میں بھرتی کرلیا۔ طبی امداد ملنے کے بعد انہیں ہوش آیا۔ خبر ملتے ہی اساتذہ اور طلبہ ان کی مزاج پرسی کے لئے پہنچ گئے۔ رئیس الجامعہ حضرت مولانا سید احمد خضر شاہ مسعودی کشمیری دام ظلہم نے ان کے خصوصی علاج کی یقین دہانی کرائی۔ موصوف ایک ہفتہ آئی سی یو میں ہی بھرتی رہے۔ بعدازاں ڈاکٹروں کے مشورے سے انہیں مظفرنگر لے جایا گیا جہاں کئی روز تک ان کا علاج جاری رہا۔ ان کی حالت اب پہلے سے مستحکم ہے، تاہم ڈاکٹروں نے انہیں آرام کا مشورہ دیا

ہے۔اب وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ اپنے گھر پر ہیں،ان کے لئے دعاء صحت کی درخواست ہے۔مولانا مظاہری سے متعلق کتابیں اساتذہ میں تقسیم کردی گئیں۔یہ اسباق الحمدللہ حسبِ معمول چل رہے ہیں۔

وفیات

حضرت مولانا محمد اسرارالحق قاسمیؒ کے لئے دعائے مغفرت

۷ردسمبر کونہایت اندوہناک خبر نے دل کو دہلا دیا۔کشن گنج بہار سے پارلیمنٹ کے ممبر حضرت مولانا اسرارالحق صاحب قاسمیؒ اچانک رحلت فرما گئے۔وہ ملک کے ممتاز عالم دین،قدآور صحافی اور موثر سیاست داں تھے۔آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ،آل انڈیا ملی کونسل،آل انڈیا ملی وتعلیمی فاؤنڈیشن سمیت متعدد دینی،فلاحی اور رفاہی اداروں سے وابستہ رہے۔دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ بھی رہے۔جمعیۃ علماء ہند کے سکریٹری اور پھر جنرل سکریٹری کے عہدے بھی انہوں نے سنبھالے۔متعدد کتابوں کے مصنف بھی رہے۔کشن گنج میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی شاخ بھی ان کی جدوجہد سے قائم ہوئی۔ملک بھر میں ان کی تقریریں ہوئیں۔جامعہ میں ان کے لئے دعاء مغفرت ہوئی۔

جناب سید اطہر شاہ صاحب کا انتقال

امام العصر علامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ کے پوتے اور اپنے عہد کے نامور اہل قلم حضرت مولانا سید ازہر شاہ قیصرؒ کے فرزند اکبر جناب سید اطہر شاہ صاحب ناگہاں ہمارے درمیان سے اٹھ گئے۔ان کی عمر ۷۰ربرس تھی۔مرحوم مرنجاں مرنج تھے اور رشتۂ ازدواج میں منسلک نہ ہوسکے تھے،پسماندگان میں تین بھائی اور کئی بہنیں ہیں۔ان کی وفات سے جہاں خانوادۂ انوری کو صدمہ پہنچا وہیں اساتذہ اور طلبۂ جامعہ رنج وغم میں ڈوب گئے۔جامعہ میں ان کے لئے دعائے مغفرت اور ایصالِ ثواب کیا گیا۔

اہلیہ متکلم اسلامؒ کی رحلت

دارالعلوم وقف دیوبند کے سابق صدرالمدرسین اور ناظم تعلیمات صاحبزادۂ حکیم الاسلام حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحبؒ کی اہلیہ محترمہ بھی اس دارِفانی سے کوچ کرگئیں۔مرحومہ صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں۔سادات سے تعلق رکھتی تھیں،مشہور مورخ اسلام حضرت مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کی دختر نیک اختر تھیں۔حضرت رئیس الجامعہ دامت برکاتہم نے پسماندگان کو تعزیت مسنونہ پیش کی۔مرحومہ کے دوفرزند ہیں،جن میں ایک محترم جناب مولانا محمد فاروق قاسمی صاحب زیدمجدہم استاذ دارالعلوم وقف

بھی ہیں۔متکلم اسلام حضرت مولانا محمد اسلم قاسمی صاحبؒ کا انتقال گذشتہ سال ۲۰۱۸ء میں ہوا تھا۔

حضرت مولانا حسیب صدیقی صاحب کا سانحۂ ارتحال

شہر دیوبند کی دینی، تعلیمی، سیاسی اور سماجی شخصیت حضرت مولانا حسیب صدیقی صاحب کا مختصر علالت کے بعد انتقال ہوگیا، انا اللہ وانا الیہ راجعون۔موصوف دیوبند کے سابق چیرمین اور مسلم فنڈ ٹرسٹ دیوبند سمیت متعدد سماجی اور فلاحی اداروں کے بانی و روح رواں تھے۔مولانا کی وفات پر جامعہ میں دعاء اور ایصال ثواب کا اہتمام کیا گیا۔حضرت رئیس الجامعہ دامت برکاتہم نے مولانا کی وفات کو اندوہناک قرار دیا اور کہا کہ دیوبند کی ایک سنہری تاریخ کا امین ہمارے درمیان سے اٹھ گیا۔اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔آمین

حضرت مولانا محمد زبیر قاسمی کا وصال

دارالعلوم دیوبند کے قدیم فرزند، وسیع الجہات شخصیت حضرت مولانا محمد زبیر قاسمی بھی مسافرانِ آخرت میں شامل ہوگئے۔مرحوم بہار کے ضلع مدھوبنی سے وطنی تعلق رکھتے تھے۔مدرسہ سبیل السلام حیدرآباد میں کئی برس شیخ الحدیث رہے۔ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مدرسہ اشرف العلوم کنہواں شمسی (سیتامڑھی) کی نظامت میں گزرا۔ان کا دورِ نظامت ادارے کے لئے تابناک عہد کا باعث بنا۔یہ ادارہ اس وقت بہار کا سب سے نمایاں ادارہ ہے۔اس کی حالیہ کارکردگی سب پر حاوی ہے۔مولانا نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا سے بھی وابستگی رکھی اور اس میں اپنے مقالات کے ساتھ مستعدی سے شریک ہوتے رہے۔ان کا انتقال علمی دنیا کے لئے ایک بڑا خسارہ ہے۔جامعہ میں ان کے لئے بھی دعائے مغفرت کی گئی۔

واردین وصادرین

جامعہ میں آنے والے اہم مہمانوں میں عمان کا ایک وفد بھی شامل ہے۔یہ وفد جامعہ کی نیک نامیوں اور علمی و تعلیمی شہرت سے متاثر ہوکر زیارت کے لئے آیا تھا۔وفد کے سربراہ جناب شوکت علی صاحب تھے۔احقر فضیل احمد ناصری نے جامعہ کا تعارف کرایا، درسگاہوں اور دفاتر کا معائنہ کرایا۔زیر تعمیر دارالاقامہ ''رواقِ انظر'' کی زیارت بھی کرائی۔مہمان بہت متاثر ہوئے اور جامعہ کی ہمہ جہت ترقی کے لئے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

❁ .... ❁ .... ❁

Monthly MUHADDIS-E-ASR Deoband
Register from Registrar of Newspapers for India U.P. URD.2000/R.N.10663
Contact: (Off) 01336-220471, Mob. +91 8006075484
Email: ahmadanzarshah@gmail.com
Printed & Published by Syed Ahmad Khizar Shah,
Mohtamim of behalf of JIMAS, Behind Eidgah, DBD
and Printed at Mukhtar Press, Samreen Printers, Deoband

جامعہ کی مرکزی عمارت ''انور ہال'' اور مسجد انور شاہ پر مشتمل شاندار منظر

مسجد انور شاہ

کتب خانہ

دار الاقامہ کا اندرونی منظر

دار الاقامہ کا بیرونی منظر

Jamia Imam Mohammad Anwar Shah
A/c No. 520101265117956
Corporation Bank Deoband, IFSC Code: CORP0000786